تعارف

حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب ہمارے ملک کے معروف اہل قلم اور صاحب تصنیف شخصیت ہیں، اردو زباں میں مختلف موضوعات پر ان کی سو کے قریب کتابیں چھپی ہیں، سندھی زبان میں انہوں نے دیڑھ سو کے لگ بھگ کتابیں شایع کی ہیں، جو سندھ کی نظریاتی کشمکش کی فضا میں نئی نسل کے لئے دعوت فکر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

بھٹو صاحب ایک دور میں ہفتہ وار کالم لکھتے تھے، جو حالات ومسائل کے تجزیے پر مشتمل ہوتا تھا، ۱۴سال تک وہ حالات ومسائل کے تجزیے کا کام کرتے رہے، ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۳ء تک، اس کے بعد انہوں نے سندھ میں بڑھتی ہوئی قوم پرستی، کمیونزم اور سیکولرزم کی تحریک کے فکری اور علمی تعاقب اور اسلام کی علمی طور پر برتری کے موضوعات پر لکھنا شروع کیا، ان کے اس علمی کام سے ہم جیسے افراد کو طاقتور اسلامی فکر ملی اور نئی نسلوں میں کام کرنے کا حوصلہ بھی ملا۔

میری آرزو تھی کہ حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کی پچاس سالہ صحافتی، علمی، نظریاتی اور دعوتی کام اور اس کام کے دوران ہونے والے مشاہدات اور اپنے دور کی اہم شخصیتوں کے حوالے سے تاثرات سامنے آئیں، تاکہ ان کی زندگی کے ان تجربات سے استفادہ کی صورت پیدا ہو۔

نیز یہ بھی خواہش تھی کہ جماعت اسلامی سے تصوف تک کے ان کے سفر کی روئداد معلوم ہو، اس سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ مختلف اہل علم دوستوں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے حالات بتائیں، تاکہ ہم انہیں اپنی کتاب کا حصہ بنائیں، لیکن بھٹو صاحب نے ان کی بات کو اہمیت نہیں دی اور کہا کہ میرے کوئی خاص حالات ومشاہدات نہیں

ہیں، اگر ہیں بھی تو وہ اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں بیان کیا جائے۔

میں نے ہمت کرکے ان کو ایک تفصیلی سوالنامہ بھیجا اور ساتھ ہی خط بھی لکھا کہ آپ کے دعوتی وعلمی کام کے دوراں پیش آنے والے حالات وواقعات اور مشاہدات ہم جیسے علمی وادبی کام کرنے والے افراد کے لئے ہمت وحوصلہ کا ذریعہ بنیں گے، آپ کے حوالے سے پچاس سالہ دور کی ایک طرح کی تاریخ بھی مرتب ہوگی، اس لئے مہربانی کرکے میرے اس سوالنامہ کا مثبت جواب دیں۔

میرے خط میں دردمندی شامل تھی، اس نے اثر کیا اور بھٹو صاحب نے ان سوالات کے تفصیلی جوابات دیئے، یہ سوالات سندھی زبان میں تھے، ان کی طرف سے جوابات بھی سندھی زبان میں دیئے گئے، اس کا اردو ترجمہ محترمہ آمنہ حامد زبیدی صاحبہ نے کیا ہے، جو بیداری سندھی کی مستقل مضمون نگار ہیں۔

اس سوال نامہ کو مجھے اپنے سہ ماہی رسالہ میں شایع کرنا تھا، لیکن سہ ماہی رسالہ کی تنگ دامنی کو دیکھتے ہوئے طے ہوا کہ یہ بیداری اردو اور سندھی میں شائع ہو، چنانچہ ان دونوں رسالوں میں اس انٹرویو کو ''ستر سالہ کہانی'' کے عنوان سے قسط وار شایع کیا گیا، اب اسے کتابی صورت دی جارہی ہے، میں حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کا ممنوں ہوں کہ انہوں نے اپنے مزاج سے ہٹ کر میرے اصرار پر اپنے حالات ومشاہدات بیان کئے اور تصوف کے حوالے سے میرے سوالات کے تفصیلی جوابات دیئے۔

۲۸ مارچ ۲۰۱۹ — **حزب اللہ سومرو**

ستر سالہ کہانی

(حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب سے لیا گیا انٹرویو)

(حزب اللہ سومرو)

سوال: ولدیت اور ذات ؟

جواب: محمّد عیسیٰ، بھٹو

سوال: جائے پیدائش ؟

جواب: جندودیرہ، ضلع شکارپور (سابق ضلع سکھر)

سوال: تاریخ و ماہ پیدائش؟

سوال: اگست ۱۹۵۱ع

سوال: تصوف سے اپنی وابستگی کے حالات ؟

جواب: تصوف میں ۱۷برس تک میرا تعلق نقشبندی سلسلے کے معروف بزرگ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خانؒ سے قائم رہا، ڈاکٹر صاحب اس دور کے چند بڑے بزرگوں میں شامل تھے، لیکن ان کی صحبت سے میں کوئی زیادہ فیض حاصل نہ کر سکا، ڈاکٹر صاحب نے جیسے تیسے کر کے سلوک طے کروا دیا، لیکن نفس کی کیفیات میں کوئی بنیادی تبدیلی یا انقلاب نہیں آیا، کچھ بزرگان سے، دوسروں کی تربیت کی اجازت بھی ملی، ان بزرگوں میں حضرت نثاراحمد خان فتحیؒ، حضرت مولانا عبدالحیؒ اور حضرت حکیم محمد رفیق صاحب شامل ہیں، لیکن ان اجازتوں میں ان بزرگوں کا حسن ظن شامل تھا، امید

ہے کہ انشاء اللہ بزرگوں کے اس حسن ظن کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں آسانی کا معاملہ ہوگا۔ (آمین)

سوال: خاص سندھی کتب جن سے ذوق وشوق ہو؟

سوال: شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام، قاضی قادن، شاہ عبدالکریم بلڑی والوں کا کلام، اور حضرت خواجہ مخدوم محمّد زمان لواری والوں کا کلام ۔

سوال: آپ کی پسندیدہ اردو کتب؟

جواب: (۱) قرآن اورعلم جدید،(۲) حکمت اقبال، یہ دونوں کتابیں مایہ ناز فلا سفر ڈاکٹر محمد رفیع الدین رح کی لکھی ہوئی ہیں۔

سوال: آپ اپنی مذہبی نشونمااور پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیں ؟

جواب: میں اب تک اپنے حالات کے بارے میں بتانے سے انکار کرتا رہا ہوں، مختلف دوستوں نے اپنی کتابوں میں میرے بارے میں لکھنا چاہا، لیکن میں نے خلوص سے ان سے معذرت کر لی۔

سوال: آپ پچھلے چالیس پچاس سالوں سے سندھ میں علمی کام کر رہے ہیں، پچھلے ۳۵ برس سے آپ انتہائی متحرک مصنف اور داعی کی حیثیت سے سرگرم ہیں، اس لئے سندھ کا علمی حلقہ آپ کے حالات کے بارے میں جاننے کا خواہشمند ہے، مہربانی فرما کر اپنے بارے میں معلومات ضرور دیں۔

جواب: میں طبعی طور پر اس کو پسند نہیں کرتا، اس لئے کہ اس سے شہرت کے خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔

سوال: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جو آپ کے آئیڈیل مفکروں، مصنفوں اور

داعیوں میں شامل ہیں، انہوں نے کاروانِ زندگی'' کے نام سے چھ جلدوں پر مشتمل اپنے تفصیلی حالات زندگی لکھے ہیں، آپ بھی برائے کرم قارئین کی خاطر اپنے اس طبعی میلان کی قربانی دیں اور اپنے حالات سے قارئین کو آگاہ کریں؟

جواب: آپ کا اصرار ہے تو کچھ حالات بتاتا ہوں، میرا تعلق خالص مذہبی نوعیت کے گھرانے سے ہے، میرے دادا حاجی محمّد سلیمان صاحب، مولانا محمّد مبارک بھٹو صاحب (جو نقشبندی سلسلے کے بڑے بزرگ تھے) کے صحبت یافتہ تھے، لیکن انہوں نے اپنی زندگی کے آخری بیس پچیس سال مولانا کی خانقاہ میں بسر کئے، یہ خانقاہ گاؤں کی جامع مسجد کے ساتھ تھی، اس کو حجرہ بھی کہتے تھے۔ میرے والد صاحب محمد عیسیٰ فقیر منش انسان تھے، گاؤں میں وہ فقیر محمد عیسیٰ کے نام سے مشہور تھے، والد صاحب کاروبار کرتے تھے، وہ تہجد گذار تھے، گھر انتہائی سادہ تھا، حالانکہ لوگوں کی مالی مدد کرنے اور قرض حسنہ دینے میں پیش پیش رہتے، اکثر قرض حسنہ والی رقم کو معاف کر دیتے تھے، کافی وقت پہلے شکارپور کے دینی مدرسے کے مہتمم مولوی شیر محمد ہکڑو صاحب نے اپنے ایک عزیز سے متعارف کروایا (جو ہمارے گاؤں میں رہ چکے تھے) میرے والد صاحب کے ذکر پر انکے آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، کہا کہ فقیر محمد عیسیٰ جیسے درویش لوگ اب ڈھونڈنے سے بھی ملنا مشکل ہیں۔

میری اس مذہبی ماحول میں نشونما کی وجہ سے، بچپن سے ہی مجھے برائی سے نفرت تھی، نیکی کی طرف رجحان زیادہ طاقتور رہا، زیادہ بولنے اور فضول گفتگو سے بیزاری ہوتی تھی، نماز کا خاص اہتمام ہوتا تھا، گاؤں میں ۵ کلاس پاس کرنے کے بعد، غالبا ۱۹۶۱ع میں مدیجی ہائی اسکول میں داخلہ لیا، تو وہاں کے جدید ماحول کے اثرات سے

شدید بیزاری ہوئی، اور میں نے اسکول چھوڑ دیا۔

سوال: آپ کے خاندان کا کس مذہبی مکتبہ فکر سے تعلق ہے؟

جواب: شروع میں تو بزرگوں کے ساتھ تعلق تھا، لیکن مولانا محمّد مبارک صاحب کے فرزند مولانا جان محمّد بھٹو صاحب، نے اہل حدیث عالم دین مولانا عبداللہ کھوکھر سے درس نظامی کی تعلیم حاصل کی، جس کے زیر اثر وہ اہل حدیث تو نہیں، لیکن توحید کے معاملے میں سخت مزاج ہوگئے۔ مولانا جان محمّد صاحب کے استاد مولانا عبداللہ کھوکھر صاحب نے مولانا محمد مبارک بھٹو کو علم غیب اور نور بشر جیسے معاملات کے بارے میں مناظرے کا چیلنج دیا، مولانا محمد مبارک پہلے تو خاموش رہے، پھر اپنے بعض مریدوں کے اصرار پر مولانا تیار ہوگئے، مولانا جان محمّد بھٹو صاحب ان دنوں ٹنڈو باگو (جو اس وقت ضلع حیدرآباد میں شامل تھا) ہائی اسکول میں عربی کے ٹیچر تھے، مولانا اس معاملے میں شرکت سے کتراتے رہے، لیکن چیلنج دینے کے بعد مناظرے والے جلسے کا انتظام کرنا اور وقت کے بڑے عالموں کو دعوت دیکر بلانا، یہ مولانا عبداللہ کھوکھر صاحب کے بس کی بات نہیں تھی۔ استاد کے اصرار پر مولانا دوچار ہفتے اسکول سے چھٹی لیکر آئے اور مناظرے کے انتظامات کئے، لیکن پھر یہ مناظرہ باپ اور بیٹے کے درمیان مناظرے کے نام سے مشہور ہوا، یہ مناظرہ ۱۹۴۷ میں ہوا، مولانا عبداللہ درخواستی اور پیر جھنڈے والے بزرگ جیسے کئی بزرگ مولانا جان محمد صاحب کی دعوت پر اس میں شریک ہوئے، لیکن اس مناظرے سے کوئی فائدہ ہونے کے بجائے سخت نقصان ہوا۔ مناظرے سے واپسی پر'' رک'' اسٹیشن پر مولانا عبداللہ درخواستی کی ناک کاٹی گئی، اور دوسری بھی زیادتیاں ہوئیں۔

سوال: کیا آپ کو لکھنے پڑھنے کا شوق شروع سے ہے، یا یہ شوق بعد میں پیدا ہوا۔

جواب: لکھنے پڑھنے کا شوق شروع سے ہی رہا ہے، ۱۲، ۱۳ برس کی عمر میں، میں نے مولانا مودودی کے ''ترجمان القرآن'' کے پندرہ بیس سالوں کے فائل پڑھ لئے تھے، جو اس وقت ہمارے گاؤں کے جماعت کے دفتر میں موجود تھے، کتابیں جمع کرنے کا بھی غیر معمولی شوق تھا، دیکھتے ہی دیکھتے اردو کی کتابوں کی اچھی لائبریری بن گئی لکھنے پڑھنے کے اس شوق نے مجھے جم کر تعلیم حاصل کرنے نہیں دی، اور پھر سولہ سال کی عمر میں شادی بھی ہوگئی۔

سوال: جماعت اسلامی سے آپ کا تعلق کب سے ہوا؟

جواب: مولانا جان محمد بھٹو صاحب ۱۹۴۶ء میں ٹنڈو باگو ہائی اسکول میں استاد ہوئے، اسی دوران مولانا مودودی کے لٹریچر سے ان کا تعلق پیدا ہوا، اور چوہدری غلام محمّد صاحب جو اس وقت سندھ میں جماعت اسلامی کے کام کے نگران تھے، مولانا سے ان کا ذاتی طور پر بھی رابطہ ہوا، چوہدری صاحب نے مولانا کو تیار کیا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر، جماعت کا کام شروع کریں، مولانا جان محمد بھٹو صاحب کی شخصیت فطرت سلیمہ کی حامل تھی، زھد و فقر کے صاحب اور توحید کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، بہترین داعی اور اہل اللہ تھے، سیرت اور کردار میں پاکیزہ تھے، ان کی کوششوں سے سندھ میں جماعت اسلامی کا کام شروع ہوا اور جماعت کو کام کے کئی افراد مل گئے، منصورہ سندھ کا تعلیمی ادارہ بھی مولانا کی کوششوں سے قائم ہوا۔ مولانا کی جماعت میں شمولیت کی وجہ سے ہمارے عزیزوں کی بڑی تعداد'' جماعت اسلامی'' میں شامل ہوگئی، میری ذھنی

تربیت بھی اسی ماحول میں ہوئی۔

سوال: آپ نے مدرسوں میں بھی کچھ تعلیم حاصل کی ؟

جواب: شکارپور میں مدرسہ دار القرآن میں استاد حافظ قاری نثار احمد صاحب کے پاس قرآن شریف کے حفظ کی تکمیل کی، دارالعلوم منزل گاہ سکھر جو جماعت کا مدرسہ تھا، جس میں دارالعلوم دیوبند کے فارغ عالم مولانا خلیل اللہ صاحب ربانی اور مولانا خلیل الرحمٰن صاحب (وہ بھی دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے) انکے پاس عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، کچھ وقت مدرستہ الاسلام میرپور خاص اور شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ میں بھی تعلیم حاصل کی، لیکن چونکہ میرا ذوق اور میلان لکھنے کی طرف زیادہ تھا، بلکہ مطالعہ اور لکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا، ان مدارس میں رہتے ہوئے بھی ہفتہ روزہ ''ایشیا'' لاہور میں میرے مضامین چھپتے تھے، اس لئے تعلیم سے طبعی مناسبت پیدا نہیں ہوسکی۔

صدر پاکستان جنرل یحیٰ خان نے ۱۹۶۸ء میں ون یونٹ ختم کرکے، صوبوں کی بحالی کا اعلان کیا، جماعت اسلامی نے ڈویژن سسٹم کو ختم کرکے، حیدرآباد میں صوبائی سسٹم قائم کیا، مجھے جماعت نے نشر و اشاعت کا ناظم مقرر کیا، اس زمانے میں'' عبرت '' اخبار سندھ کا سب سے بڑا اخبار تھا۔ قاضی اکبر صاحب اس کے مالک تھے، قاضی صاحب چاہتے تھے کہ الیکشن میں انہیں جماعت کی حمایت حاصل ہو، اس لئے طے ہوا کہ میں ''عبرت'' میں مضامین کا سلسلہ شروع کروں۔ پانچ، سات ماہ تک'' عبرت'' (سندھی اخبار) میں میرے مضامین شایع ہوتے رہے، اس کے بعد ۱۹۶۹ء کے آخر یا ۱۹۷۰ء کے شروع میں جماعت کا اپنا اخبار''الوحید'' حیدرآباد سے جاری ہوا، یہ روزنامہ

اخبار تھا، اس میں میں نے مضمون نگار کی حیثیت سے کام شروع کیا، لیکن جماعت اسلامی، جسکی اس وقت پورے ملک میں دھاک قائم تھی کہ وہ الیکشن میں سب سے زیادہ ووٹ لیکر، اسمبلی میں بڑی پارٹی کی حیثیت سے سامنے آئیگی، اس کو پورے ملک میں قومی اسمبلی میں کل چار سیٹیں ملیں، جماعت کی اس ناکامی کی وجہ سے ''الوحید'' اخبار بند ہو گیا، اس کی بندش سے پہلے میں نے 'روزنامہ جسارت'' ملتان میں لکھنا شروع کیا تھا، پھر روزنامہ ''جسارت'' ملتان بند ہو گیا، اس کے بعد میں ''روزنامہ جسارت'' کراچی میں وقایع نگار خصوصی کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ یہ فروری ۱۹۷۱ع کی بات ہے۔

میں ''جسارت'' سے ۱۹۸۳ع تک وابستہ رہا، اس عرصے میں ''جسارت'' دو چار بار بند بھی ہوا، ۱۹۸۴ع میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے اس وسیع علمی تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے سندھی زبان میں نظریاتی اور علمی لٹریچر کا کام کا کام شروع کرنا چاہئے۔ میں نے ۱۹۸۳ع میں اخبار کو چھوڑ کر، سندھ نیشنل اکیڈمی کے تحت سندھی زبان میں کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کردیا، یہ کتابیں زیادہ تر کمیونزم، نیشنلزم، سیکیولزم، جدیدیت، مغربی تہذیب اور اسلام کے تقابلی مطالعی پر مشتمل تھیں۔

سوال: آپ کی ذہنی نشونما میں جن شخصیات کی صحبت نے کردار ادا کیا، کیا آپ اس کی تفصیل بتانا پسند کرینگے؟

جواب: مجھے ۱۹۶۹ع سے لیکر جن علمی افراد کی صحبت حاصل رہی، جن کی صحبت سے میں نے بہت کچھ سیکھا، ان میں مولانا خیر محمّد نظامانی صاحب، میاں محمّد شوکت صاحب، قربان علی بگٹی صاحب، مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب، مولانا سید وصی مظہر

ندوی صاحب، مولانا جان محمّد عباسی صاحب، سید سردار علی شاہ، ''ذاکر'' صاحب، سید علی میر شاہ وغیرہ شامل ہیں، یہ سب علمی اعتبار سے اہم شخصیات تھیں، لیکن میں نے مولانا خیر محمّد نظامانی صاحب، میاں محمّد شوکت صاحب اور قربان علی بگٹی صاحب کے مطالعے اور مشاہدے سے کافی کچھ حاصل کیا، ان سے میری نگاہ میں وسعت پیدا ہوئی اور ''روز نامہ جسارت'' میں ہفتہ وار مضامین کو مؤثر بنانے میں بھی مدد ملتی رہی۔

سوال: جماعت اسلامی سے آپ کا تعلق کب تک رہا؟

جواب: دینی اور مذہبی جماعتوں سے میرے اب بھی تعلقات قائم ہیں، جماعت اسلامی سے میں نے علمی اور فکری طور پر بہت کچھ سیکھا ہے، اس لئے بظاہر جماعت کو چھوڑنے کے باوجود ان سے ایک قسم کی وابستگی قائم ہے، ویسے بھی صوفی کسی کو غیر نہیں سمجھتا، وہ ہر ایک سے محبت کرتا ہے، صوفی طبعی طور پر اس طرح کے مزاج کا حامل ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقابلے میں دوسروں کو زیادہ بہتر اور افضل سمجھتا ہے۔ البتہ صوفی کے لئے افراد، اداروں اور جماعتوں کی فکری کمزوریوں کو سمجھنا ناگزیر ہے۔

سوال: جماعت اسلامی اور تصوف، ایک دوسرے متضاد نظر آتے ہیں، کیا آپ جماعت سے تصوف تک کے سفر کی کہانی سنانا پسند کرینگے؟

جواب: جماعت اسلامی، اسلام کیلئے علمی اور سیاسی میدان میں جو کام کرتی رہی ہے، خاص طور پر آج سے تیس سال پہلے تک، وہ کام ہر اعتبار سے قابل قدر اور لائق ستائش تھا، لیکن مجھے شدت سے محسوس ہوا کہ جماعت میں کسی نہ کسی چیز کی کمی ضرور ہے کہ جس کی وجہ سے میری اور جماعت سے وابستہ میرے دوسرے دوستوں کی حالت یہ رہی ہے کہ وہ نماز کیلئے مسجد میں سب سے آخر میں آتے ہیں، اور سب سے

پہلے نکل جاتے ہیں، پھر دوسروں کے بارے میں حسن ظن کی کمی اور ناراضگی کا ہونا، عبادت سے برائے نام دلچسپی کا ہونا، سیاسی تجزیوں اور تبصروں کے لئے زیادہ سرگرمی کا ہونا، سیاسی کاموں کو دین کا نصب العینی کام سمجھنا، مجددین امت کے علمی کام کو اہمیت نہ دینا، مولانا مودودی کی اسلامی فکر کو حرف آخر سمجھنا، صوفیائے کرام کے تربیتی کام کو اہمیت نہ دینا، بلکل غیر ضروری سمجھنا، سب سے زیادہ جو تشنگی رہی، وہ قلبی سکون سے محرومی، رواداری اور محبت کی کمی تھی، جو میری اپنی شخصیت میں دوسروں سے زیادہ موجود تھی۔

جماعت اسلامی کے فکری سانچے میں رہتے ہوئے، ان کوتاہیوں کے احساس نے مجھے دور جدید کے مفکروں اور فاضلوں کی کتابوں کے مطالعے کی طرف راغب کیا، میں نے پانچ سات سال تک بیسویں صدی کے تقریباً سارے مفکروں کی بیشتر کتابوں کا مطالعہ کرلیا، ان مفکروں میں مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، ڈاکٹر محمّد رفیع الدین، مولانا محمّد حنیف ندوی، خلیفہ عبدالحکیم، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا وحیدالدین خان، علامہ عنایت اللہ مشرقی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مناظراحسن گیلانی وغیرہ وغیرہ، شامل ہیں، ان فاضلون کے وسیع مطالعے سے جہاں میری فکر میں وسعت پیدا ہوئی ، وہاں یہ بھی محسوس ہوا کہ موجودہ دور کے علمی، فکری اور علمی چیلنج اور ان کے مزاج نے مولانا مودودی کو آمادہ کیا کہ وہ نئی نسل کو دین کے بنیادی عقائد پر قائم رکھنے کیلئے دین کی ایسی تشریح کریں، جس میں اسلام نظام زندگی کی حیثیت سے سامنے آئے، تاکہ نئی نسل میں موجودہ دور کی عالمگیر نوعیت کے مادّی نظریات سے مرعوبیت کی فضا ختم ہو، اس سلسلے میں یقیناً مولانا

مودودی کا کام انتہائی اہم اور قابل قدر ہے، اور اس سے پورے عالم اسلام کے ذہین افراد کا دین اسلام پر اعتماد بحال ہوا، لیکن اسلام کی نظام زندگی کی حیثیت کو اجاگر کرنے میں اس کے عبادتی پہلو کی حیثیت سخت مجروح ہوئی اور اس سے دین کی ترتیب وپیشکش میں یہ کمی واقع ہوئی کہ نفس کے تزکیہ ، دل کی اصلاح، اللہ کی محبت، ذکر وفکر اور عبادت سے شغف وغیرہ جیسی اہم چیزیں ثانوی حیثیت اختیار کر گئیں، بہرحال اس سارے مطالعے کے بعد مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ بندہ مؤمن کیلئے پہلا ہدف، ذکر فکر اور صحبت صالحہ کے ذریعے اپنے نفس سے جنگ کرنا ہوتا ہے، اس جنگ میں جب وہ قدرے کامیاب ہوجاتا ہے تو اس کے بعد اسکا دوسرا ہدف خارجی باطل ہوتا ہے۔

فکری طور پر اس الجھن کے سلجھ جانے کے بعد میں نے اہل اللہ کی صحبت اختیار کی، جس سے محسوس ہوا کہ اہل اللہ کی صحبت کے بغیر دین کی حقیقی نصب العینی فکر کا فہم حاصل ہونا مشکل ہے، کیونکہ نفس کی ہولناک قوتوں اور نفسانی بیماریوں کا علم و ادراک، اور دل و روح کی نزاکتوں کے فہم کا تعلق مطالعے سے نہیں، ان چیزوں کا تعلق صاحب حال بننے، اور تقویٰ اور تزکیہ سے ہے، تقویٰ اور تزکیہ، صاحب تقویٰ اور صاحب تزکیہ شخصیتوں کی صحبت کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے، امت کی پوری تاریخ کا تسلسل بھی یہی ہے۔

سوال: جماعت اسلامی سے وابستگی کے پورے عرصے میں آپ سب سے زیادہ کن شخصیات سے متاثر رہے؟

جواب: تقویٰ، اخلاص اور للھیت کے اعتبار سے مولانا جان محمد بھٹو صاحب سے، جن کی شخصیت پر میں نے اردو اور سندھی میں کتاب لکھی ہے، دوسرے میاں محمد شوکت

صاحب سے، جو جماعت اسلامی میں شامل ہونے سے پہلے برسوں تک مولانا حسین احمد مدنی سے وابستہ رہے، ان کی شخصیت میں مولانا مدنی کی صحبت کے اثرات موجود تھے۔

علمی اعتبار سے میں عبدالکریم عابد صاحب اور قربان علی بگٹی صاحب سے متاثر ہوا۔ عبدالکریم عابد صاحب تو پاکستان کے صحافیوں میں بڑے دانشور صحافی تھے، حالاتِ حاضرہ اور ملکی مسائل پر انکے تجزیے ایسے ہوتے تھے کہ گویا ہر مسئلے کا حل آنکھوں کے سامنے آتا، جماعت کے دانشوروں میں عبدالکریم عابد صاحب واحد دانشور تھے، جو افراد کی زندگی کو بدلنے کے سلسلے میں تصوف کے کردار کے پوری طرح قائل تھے۔ میرا جب اہل تصوف سے تعلق قائم ہوا تو انہوں نے اس بات کو پسند کیا اور میری حوصلہ افزائی کی، کہا کہ آپ کو نئی ایمانی کیفیات حاصل ہونگی، اور تصوف کے حق میں ایک مضمون بھی لکھوایا۔

قربان علی بگٹی صاحب، وسیع اور گہرے مطالعے کے حامل شخص تھے، سندھ میں اتنے مطالعہ والا کوئی دوسرا فرد نظر نہیں آتا، انکا حافظہ بھی تیز تھا، جو چیز ایک بار پڑھتے، وہ آخر وقت تک یاد رہتی، اقبال اور بھٹائی کے کلام تو گویا حافظ تھے۔

سوال: یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ سندھی زبان میں آپ کے شروع کردہ علمی، فکری اور نظریاتی کام میں آپکو جماعت اسلامی کی مالی معاونت حاصل تھی، اور آپ نے یہ سارا کام جماعت اسلامی کی منصوبہ بندی کے مطابق کیا؟

جواب: یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ تصوف سے وابستگی کی وجہ سے جماعت اسلامی کی قیادت نے یہ محسوس کیا کہ موسیٰ صاحب مستحکم ہونے کے بعد ہماری فکر کے

خلاف کام کریں گے، اور سندھ میں ہمارے لئے مسائل پیدا کریں گے۔ یہ دراصل، تصوف کے مزاج اور اس کی نوعیت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ تھا۔ تصوف تو اپنوں اور غیروں سب سے عملی طور پر محبت کرنا سکھاتا ہے۔ اور فرد میں ہر سطح پر ہونے والے دینی کام کو، اپنا کام سمجھنے کا احساس غالب کرتا ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے جماعت کی لیڈر شپ نے میرے شروع کئے ہوئے اس علمی کام کی مخالفت کی اور جماعت کے ایک دانشور نے، جماعت کے اس وقت کے ہفتہ وار سندھی رسالے میں میرے خلاف مضامین کا سلسلہ بھی شروع کیا، جس کا عنوان تھا ''معروف صحافی'' میں ان کے لکھے ہوئے مضمون کی ہر قسط کے چھپنے کے بعد ان کے رسالے کے دفتر میں جاکر ملتا تھا، اور عرض کرتا تھا کہ یہ سب آپکی غلط فہمی ہے۔ البتہ جماعت کی فکر سے متاثر ایک شخصیت، جس کا جماعت کی تنظیم سے کوئی واسطہ نہ تھا، اس نے ہمارے ساتھ اس کام میں انفرادی حیثیت سے تعاون ضرور کیا۔

البتہ فکری طور پر میری تربیت میں جماعت اسلامی کا اہم کردار ہے، جماعت سے وابستگی کے نتیجے میں ہی مجھ میں علمی، فکری اور تحریری صلاحیتیں اجاگر ہوئیں۔ البتہ اہل تصوف سے وابستگی کے نتیجے میں کام کرنے کا جو حوصلہ، ہمت، قوت ارادی اور خوداعتمادی پیدا ہوئی، وہ ایسی ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میری طرف سے ہونے والا سارا کام دراصل اللہ کی ذات پر توکل کا نتیجہ رہا ہے، جو میں سمجھتا ہوں اہل اللہ کی صحبت کا فیض ہے، کیونکہ، مجھ جیسا فرد، جو دینی اور جدید علوم کے اعتبار سے بہت پیچھے ہو، جو ظاہری وسائل کے اعتبار سے بھی تہی دامن ہو، (آج بھی حالت یہ ہے کہ ''بیداری'' اور دوسری کتابوں کی اشاعت کیلئے وسائل نہ

ہونے کے برابر ہیں) دفتر میں علمی اور عملی معاونت کرنے والا کوئی فرد موجود نہ ہو، ایسے فرد سے ۳۵،۴۰ سالوں سے مسلسل کام لینا، اردو اور سندھی زبان میں تقریباً دھائی سو کتابوں کا شایع ہونا، یہ محض اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔

موجودہ دور میں یہ تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ کوئی فرد کسی جماعت، کسی تاجر برادری، یا کسی سرمائیدار کے تعاون کے بغیر اتنا بڑا علمی اور اشاعتی کام کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر علمی مزاج رکھنے والا کوئی درد مند فرد، اپنا دل کسی اہل اللہ کے حوالے کرے تو اس کا دل روشن ہونا شروع ہوجاتا ہے، اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اسکے لئے کام کی راہیں آسان کر دیتا ہے۔

میری طرف سے تصوف پر اتنا زور دینے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہونے کی وجہ سے فرد زمینی حقائق سے بلند ہو کر، اللہ کی مدد والے خاص قانون کے دائرے میں آجاتا ہے، اس نکتے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عام طور پر فرد خدمت دین اور غلبۂ دین کے کام کا جذبہ تو رکھتے ہیں، لیکن عملی طور پر پیش قدمی کرنے سے قاصر ہیں۔

سوال: اس بات میں کہاں تک سچائی ہے کہ شیخ ایاز صاحب آپکی کوششوں سے اسلام کی طرف رجوع ہوئے؟

جواب: یہ بات صحیح نہیں۔ شیخ ایاز پر اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل کیااور اسے اسلام کی نعمت عظمیٰ عطا فرمائی، البتہ آخری دنوں میں شیخ صاحب سے میرا کافی تعلق رہا، چار پانچ ملاقاتیں بھی ہوئیں، ان کی دعاؤں کے مجموعے پر مشتمل کتاب کا پہلا ایڈیشن، میری نظر ثانی اور تفصیلی پیش لفظ کے ساتھ شایع ہوا۔ خط وکتابت بھی ہوتی

رہی، جو ہماری طرف سے شایع شدہ کتاب ''شیخ ایاز کے آخری دس سال'' اور ''پیام محبت'' میں موجود ہے۔ ہاں، یہ بات صحیح ہے کہ شیخ ایاز کے اضطراب کو دیکھتے ہوئے میں نے ممتاز مہر صاحب کے ذریعے انہیں مشورہ دیا کہ وہ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب (جو سندھ یونیورسٹی میں شیخ ایاز کی وائیس چانسلری کے دور میں اردو ڈپارٹمنٹ کے سربراہ بھی تھے) جو نقشبندی سلسلے کے نہایت کامل بزرگ ہیں، ان سے غائبانہ طور پر بیعت کا تعلق قائم کریں، الحمدللہ میرے کہنے پر شیخ ایاز نے ڈاکٹر صاحب سے خط کے ذریعے غائبانہ بیعت اختیار کی اور ذکر بھی لیا، شیخ ایاز کا ڈاکٹر صاحب کے نام خط اور اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی طرف سے ذکر کی اجازت والا خط، مجھ سے کہیں کھو گیا ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔

سوال: کیا آپ نے دعوتی کام کے سلسلے میں محمد ابراہیم جویو صاحب اور جام ساقی کو بھی خطوط ارسال کئے تھے؟

جواب: محمد ابراہیم جویو صاحب کے نام میرا ایک جامع خط ''پیام محبت'' کتاب میں شامل ہے، جویو صاحب سے کافی عرصہ پہلے، جب ان کا ذہن ایک حد تک صحیح سالم تھا، محترم سکندر صاحب کے ساتھ میں انکے گھر ان سے ملاقات کیلئے گیا تھا، شاہ کا رسالہ اور دوسری اہم کتابیں ان کی خدمت میں پیش کی تھیں۔

جام ساقی کے بارے میں، میں نے شیخ ایاز صاحب سے کچھ معلومات حاصل کیں، انہوں نے بتایا کہ جام ساقی ذہنی طور پر بہت پریشان ہے، میرے پاس آتے رہتے ہیں، وہ کارکن ٹائیپ شخص ہے، دانشورانہ مزاج نہیں رکھتا، شیخ ایاز نے یہ بھی کہا کہ، آپ اگر ان سے ملاقائیں کریں تو شاید وہ اسلام کی صحیح راہ پر گامزن ہو، اس سلسلے

میں میں نے ان سے ٹیلیفون پر بھی رابطہ رکھا اور ان سے ملاقات کیلئے ان کے گھر پر بھی گیا، لیکن جام صاحب کی طرف سے کسی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں ہوا، انہوں نے تبلیغی جماعت کے ساتھ جانے کیلئے کچھ وقت نکالا تھا اور بزرگوں کے مزارات پر بھی حاضری دیتا تھا، لیکن ایسی شخصیت کیلئے سب سے پہلے مطالعے کے ذریعے صحیح اسلامی فکر سے مستفید ہونا ضروری ہے، تاکہ اسلامی نظریئے پر علمی طور سے پوری طرح اعتماد بحال ہو سکے، لیکن ان کو یہ سعادت حاصل نہ ہوسکی۔

سوال: کیا آپ سندھ میں کمیونسٹ اور سیکیولر نظریاتی تحریکوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہینگے؟

جواب: سندھ میں کسی زمانے میں کمیونسٹ فکر بہت طاقتور تھی، جی ایم سید کے قوم پرست نظریے نے کمیونسٹ تحریک کو فروغ دیا، کیونکہ قوم پرست نظریے کی بنیاد مستحکم نہیں ہوتی، قوم پرستی کا نظریہ زیادہ دیر لوگوں کو متحرک نہیں رکھ سکتا۔ قوم پرست تحریک نے جو ذہین افراد تیار کئے، ان کا ایک بڑا طبقہ کمیونسٹ فکر اور کمیونسٹ تحریک میں چلا گیا، لیکن سوویت یونین کے ٹوٹنے بعد سندھ میں کمیونسٹ فکر میں زوال شروع ہوا، جام ساقی، کامریڈ میر محمد نظامانی، بدر ابڑو اور ممتاز مہر جیسے سینکڑوں دانشور تصوف کی چھاؤں میں پناہ لینے لگے، دوسرے یہ کہ ان کے باہمی شدید اختلافات نے بھی کمیونسٹ تحریک کو نقصان پہنچایا۔

البتہ سندھ کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں سیکیولر تحریک کافی طاقتور ہے، سیکیولر زم کا مطلب ہے عملی، اجتماعی زندگی میں دین سے آزاد، محض عقلیت کی بنا پر زندگی گذارنے کا ڈھنگ (یعنی ایسی زندگی جس میں مذہبی پابندیاں نہ ہوں) اس فکر کو

پرانے کمیونسٹ دانشور انتہائی قوت سے فروغ دے رہے ہیں، عالمی سرمائیدار اس تحریک کی سرپرستی کررہا ہے، اور این جی اوز اس تحریک کے فروغ کیلئے کام کررہی ہیں۔

چونکہ سندھ میں قوم پرست اور اور کمیونسٹ تحریک کی فکری بنیاد بڑی حد تک مستحکم رہی ہے، ہزاروں کتابیں اس نظریے کی پس پشت موجود ہیں۔ اور الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا بھی اس تحریک کو فروغ دے رہی ہیں، جس سے لگتا ہے کہ پرانے کمیونسٹ فکر کے حامل دانشوروں کی بڑی تعداد ایکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا پر قابض ہو چکی ہے، اسلئے سندھی میڈیا پر زندگی کے مسائل کے بارے میں اسلامی نقطہ نگاہ پیش کرنے نہیں دیا جاتا۔

اس وقت سندھ کے ساتھ ساتھ پورے عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ سیکیولرزم ہے، جسکے مطابق اپنی معاشرتی، اجتماعی اور معاشی زندگی، عقل، عقلیت پرستی اور نفس کی خواہشوں کے تحت گذارنا ہے، جس کے تحت اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کو فراموش کرنا ہے اور زندگی کا سارا نقشہ مادیت، مادی آسائشوں اور اور مادی نوعیت کی لذتوں کے مطابق بنانا ہے، سیکیولرزم کی یہ فکر آجکل سب سے زیادہ طاقتور ہے، جو اسلام کے مکمل نظام زندگی کیلئے بہت بڑا چیلنج ہے۔

چونکہ، یہ فکر نفس کی خواہشوں کے مطابق ہے اور عالمی سرمائیدار اس فکر کو فروغ دینے کیلئے عالم اسلام میں اربہا ڈالر خرچ کررہا ہے، ہمارے سندھی دانشور بھی عام طور پر آجکل اس فکر کے فروغ کیلئے بہت کام کر رہے ہیں۔

سندھ کے کمیونسٹ دانشور محمد ابراہیم جویو صاحب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں ''سیکیولرزم اور عقلیت پسندی'' کے نام سے کتاب لکھکر، اپنی فکر سے وابستہ افراد کو

اس بات پر اکسایا کہ، انسان، کائنات اور زندگی کے متعلق سیکیولر فکر پر قائم رہو۔

الغرض کہ، سندھ میں کمیونسٹ اور قوم پرست تحریک نے سیکیولر فکر کی صورت اختیار کر لی ہے، لیکن چونکہ اس تحریک کے کئی بڑے دانشور دین، مذہب اور تصوف کی چھاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے ہیں، اسلئے سندھ میں اس تحریک کی بنیاد ایک حد تک کمزور ہوچکی ہے، نئی نسل کی اسلامی اعتبار سے رہنمائی کرکے انہیں سیدھے رستے پر لانے اور ان کی تربیت کیلئے اگر ذہین دینی افراد سامنے آئیں تو سندھ میں اسلامی نظریئے کے پھولنے کیلئے سنہری موقعہ ہے۔

سوال: کیا ناسازگار حالات اور وسائل کے بغیر بھی دعوتی اور علمی کام ہوسکتا ہے؟

جواب: دینی کام کیلئے اصل چیز جذبہ، اضطراب، تحرک، اخلاص، استقامت، صلاحیت اور بہتر حکمتِ عملی کی ضرورت ہوتی ہے، اگر یہ چیزیں موجود ہیں، تو پھر اللہ کی طرف سے مدد کی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، چاہے بڑے پیمانے پر نہ سہی، لیکن کسی نہ کسی حد تک کام ضرور ہوتا رہیگا۔ لیکن اگر یہ چیزیں موجود نہیں، تو وسائل چاہے کتنے بھی موجود ہوں، سارے وسائل کے باوجود کام نہیں ہوسکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز تعلق باللہ، دینی حمیت اور اخلاص ہی ہے، ان صفات کے بعد اللہ کی طرف سے راہیں آسان کردی جاتی ہیں، اور برکت کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، اس لئے علمی کام کرنے والے باصلاحیت افراد کو زیادہ سے زیادہ فکر، اللہ سے اپنے تعلق کو مستحکم کرنے میں صرف کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ ایسے افراد کو زمانے کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑتے۔

سوال: آپ نے اہل تصوف سے تعلق قائم کرنے سے پہلے، کیا اہل تصوف کی

کتابوں کا مطالعہ کیا تھا؟

جواب: میں نے ۱۹۷۲ع سے اہل تصوف کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا تھا، مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی کتابیں مسلسل میرے مطالعے میں رہتی تھیں۔ ۱۹۷۲ع سے ۱۹۸۴ع تک میں نے تصوف کی بہت ساری کتابیں پڑھیں، اہل تصوف کی کتابوں میں اخلاص، للھیت، بے نفسی اور باطنی بیماریوں سے بچنے پر بہت زیادہ زور تھا۔ کتابوں کے مطالعے کے ذریعے کوشش کی کہ دل میں اخلاص پیدا ہو، باطنی برائیوں سے حفاظت کی صورت پیدا ہو، لیکن ساری کوشش کے باوجود عملی طور پر ایسا نہیں ہو سکا۔ ایک بار جماعتِ اسلامی کی صاحب علم شخصیت، میاں محمد شوکت صاحب جو جماعت اسلامی میں شامل ہونے سے پہلے، مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت تھے اور برسوں تک ان سے روحانی فیض حاصل کرتے رہے تھے، میں نے ان سے ذکر کیا کہ، اہل تصوف اخلاص، للھیت، عبادت میں ذوق وشوق اور اللہ کی محبت کی جن کیفیات پر زور دیتے ہیں، کافی کوشش کی ہے کہ یہ کیفیات حاصل ہوں، لیکن کامیابی نہیں ہوئی، میاں صاحب نے کہا کہ، یہ چیزیں کتابوں کے مطالعے سے حاصل نہیں ہونگی، بلکہ یہ تو کسی اللہ والے سے باقاعدہ تعلق کے نتیجے میں ہی پیدا ہونگی۔

اس سے اندازہ لگائیں کہ، برسوں تک تصوف کی کتابیں پڑھنے کے باوجود، عشق ومحبت کے معمولی اجزاء بھی حاصل نہ ہوسکے، دوسری طرف ۱۹۸۴ع کے آخر میں اہل اللہ سے تعلق قائم ہوا، تو یوں محسوس ہوا، گویا نئی زندگی مل گئی ہو۔

سوال: آپ تصوف سے اپنی عملی وابستگی کی تفصیل بتائینگے؟

جواب: تصوف میں سالک، نفس کی قوتوں کو فنا کرنے، اللہ کے ساتھ باقی رہنے

کی مستقل حالت کے حصول کیلئے جو مجاہدے اور ریاضتیں کرتا ہے، وہ سالک اور محبوب کے درمیاں ذاتی نوعیت کے معاملات ہوتے ہیں، وہ ظاہر کرنے والے نہیں ہوتے۔

سوال: اگر آپ، افراد میں شوق پیدا کرنے کیلئے کچھ تفصیل بتائیں تو اس سے شاید مجھ جیسے افراد میں، راہ سلوک میں چلنے کی طلب اور امنگ پیدا ہو؟

جواب: آپ کے ذوق کو دیکھتے ہوئے، جزوی طور پر کچھ باتیں بتاتا ہوں۔

میں کافی وقت سے تصوف کی کتابیں پڑھتا رہا تھا اور روحانی کیفیات کے حصول کیلئے دل میں طلب بھی موجود تھی، اسی طلب میں اضافہ ہوا اور میں ۱۹۸۲ع میں پیر ایرانی شاہ صاحب سے بیعت ہونے کیلئے پروفیسر عبدالقادر لغاری صاحب کو ساتھ لیکر سکھر گیا، پیر صاحب سکھر میں سال کے چند مہینے گذارتے تھے، ان کا اصل مرکز حیدرآباد میں پریٹ آباد تھا۔

سوال: پیر ایرانی شاہ صاحب کون تھے؟

جواب: پیر ایرانی کا اصل نام صبغتہ اللہ تھا، سید تھے، ایران میں فوج میں میجر تھے، یہ ۱۹۲۰ع کے زمانے کی بات ہے، وہاں ان کا ایک بزرگ سے تعلق قائم ہوا، بزرگ نے انہیں سلوک میں چلایا، پھر بزرگ نے ان سے کہا کہ ''تمہاری طلب بہت زیادہ ہے، میرے پاس جو فیض تھا، میں نے تمہیں دے دیا، اب تم ہندستان جاؤ، وہاں تمہیں انشاء اللہ بہت اچھے بزرگ ملینگے، جو تمہیں سلوک میں بہتر طور پر چلا کر تمہاری تشنگی پوری کرینگے، یہ پاکستان بننے سے کافی پہلے کا ذکر ہے، شاہ صاحب ''مری'' آئے، مری میں ان دنوں ایک نامور بزرگ رہتے تھے، وہ ان سے ملے تو بزرگ نے کہا کہ مجھے تمہارا انتظار تھا۔

اس کے بعد ان کی طلب کو دیکھتے ہوئے بزرگ نے انہیں مجاہدوں کی راہ پر چلایا، دس برس تک وہ عشاء کی نماز کے بعد صبح کی اذان تک حالتِ مراقبہ میں رہتے تھے۔ جب باقائدہ سلوک طے ہوگیا تو بزرگ نے انہیں سندھ بھیجا کہ وہ وہاں جاکر لوگوں کی اصلاح اور تربیت کا کام شروع کریں، سندھ میں انہوں نے حیدرآباد کو اپنا مرکز بنایا، انکی ملفوظات پر مشتمل پانچ، سات کتابیں موجود ہیں، جن کے مطالعے سے ان کی روحانی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے، تصوف کو بہتر انداز سے پیش کرنے کی ان میں غیرمعمولی صلاحیت موجود تھی، خاص طور پر جدید دور کے علمی افراد کیلئے ان کی کتابیں بہت قیمتی ہیں۔

سوال: پیر ایرانی شاہ صاحب سے آپ نے کتنا وقت استفادہ کیا؟

جواب: پیر صاحب سے میں کوئی خاص استفادہ نہ کر سکا، کیونکہ اس وقت مجھ میں حقیقی طلب پیدا نہیں ہوسکی تھی، وقتی اور ہنگامی جذبہ تھا، جو جلد ہی ٹھنڈا ہوگیا، میں تقریبا دو سال تک صحافتی اور تصنیف وتالیف کے کام میں مصروف رہا، لیکن اس دوران یہ خواہش بڑھتی رہی، اب حقیقی طلب پیدا ہوئی اور اندرونِ سندھ کے ایک نوجوان بزرگ سے صحبت کا تعلق قائم ہوا، پھر چار برس تک بزرگ سے تعلق قائم رہا۔ ان کی صحبت کیلئے ہر مہینے دو دن کیلئے میں ان کے پاس جاتا رہا، لیکن ایک تو میرا ذکر کا سلسلہ جاری نہیں ہو سکا تھا، بس صحبت اور نظر کا فیض تھا، ان کی خانقاہ میں بزرگ کی ذات میں فنا ہونے کی فضا موجود تھی، فنا فی الشیخ کا یہ خانقاہی نظام میرے مزاج کے خلاف تھا، بہرحال بزرگ سے جتنا عرصہ تعلق رہا، ذکر نہ ہونے کے باوجود مجھے روحانی طور پر کافی فائدا ہوا، اس سے تصوف کی قوت کا اندازہ ہوا۔

سوال: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب نے آپ کو باقاعدہ راہ سلوک میں چلایا یا فیض نظر میں رکھا؟

جواب: فیض نظر کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ بزرگ تسخیری وظائف کا عامل ہو، اور نظر کو ایک نکتے پر جمانے کی مشقوں کا حامل ہو، جس سے ان کی شخصیت میں غیرمعمولی کشش محسوس ہو، ڈاکٹر صاحب اس قسم کے تسخیری نوعیت کے عمل کے قائل نہ تھے۔

فیض نظر کی دوسری صورت، جو حقیقی اور فطری صورت ہے، وہ یہ ہے کہ بزرگ، ذکروفکر کے غیرمعمولی مجاہدوں اور اپنے شیخ کی طویل عرصے کی صحبت کے نتیجے میں حالت فنا سے حالت بقا تک پہنچا ہو، جس سے ان کے نفس کی سرکش قوتیں مضمحل ہوچکی ہوں اور وہ بزرگ زہد وتقویٰ کا نمونہ بن چکا ہو، ایسے بزرگ کی صحبت کی تاثیر سے فرد کی زندگی میں حیرت انگیز طور پر تبدیلی کا عمل شروع ہوجاتا ہے، کوئی فرد اگر اس قسم کے بزرگ کی صحبت اختیار کرکے، ذکر وفکر شروع کردے تو دس، پندرہ برس کے دوران روحانی ترقی کرکے کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

سوال: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحبؒ کی صحبت سے آپ کو خاطر خواہ فائدہ محسوس ہوا؟

جواب: ڈاکٹر صاحب سے میرا تعارف بہت پرانا تھا، ''جسارت'' اخبار میں میرے مضامین بھی ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گذرتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے میری حقیقی طلب کو دیکھتے ہوئے، مجھے باقاعدہ سلوک میں چلایا، اب میری سرگرمیوں اور جدوجہد کا مرکز سلوک ہی بن گیا، دوسرے سارے کام پس پشت چلے گئے، تقریبا روزانہ ڈاکٹر

صاحب کی صحبت حاصل ہوتی رہی، عصر کی نماز میں ڈاکٹر صاحب کی مسجد میں پڑھتا تھا، مغرب کی نماز کے بعد وہاں سے واپسی ہوتی تھی، یہ میرا روز کا معمول بن گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس ہر سطح کے افراد آتے تھے، لیکن ان سے قریب ہونے کے باوجود میں ان کو پہچانتا نہیں تھا۔ کیونکہ سلوک ایسی چیز ہے، جو فرد کو ادھر ادھر دیکھنے سے دور کردیتی ہے، اور فرد کا اصل مقصد نفس کی قابل ذکر حد تک اصلاح، اور اللہ سے تعلق مستحکم کرنا بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے میری صحبت ۱۷ سال تک رہی، اور لگ بھگ پندرہ برس تو روزانہ رہی، اس میں ملاقات اور گفتگو بہت کم ہوتی تھی، بس دور سے زیارت ہوتی تھی، البتہ ڈاکٹر صاحب جمعے اور پیر کے دن ہونے والے اجتماعی مراقبے کے موقعے پر مجھے اپنے قریب بٹھاتے تھے، میں اگر دور بھی بیٹھا ہوتا تو ا شارہ فرما کر، مجھے اپنے قریب بلاتے تھے، یہ ڈاکٹر صاحب کی خاص محبت ہوتی تھی، ان کی اسی محبت کے طفیل سترہ سال شب وروز چلنے سے سلوک کا یہ سفر کسی حد تک طے ہوگیا اور نقشبندی مجددی سلسلے کے سارے اسباق پورے ہوئے۔

سوال: آپ نے ''کسی حد تک'' سلوک طے ہونے کی بات کی ہے، اسکی وضاحت کرینگے؟

جواب: راہ محبت اور راہ سلوک میں سالک کو نفس کی اتھاہ قوتوں کا جو اندازہ یا تجربہ ہوتا ہے، اور اللہ کی جس شان عظمت کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے، وہ ایسا ہے جس میں سالک سمجھتا ہے کہ اللہ کے بندوں میں مجھ سے زیادہ گنہگار اور سیاہ کار دوسرا کوئی نہیں ہوسکتا اور اللہ کے عتاب کا سب سے زیادہ مستحق میں ہی ہوں، سالک پر یہ احساس مستقل طاری رہتا ہے، یہی احساس اسے بزرگ بننے کی نفسیات سے بچاتا ہے

اور بزرگی کی دعویٰ سے بچاتا ہے، یہی احساس ہے، جس کی وجہ سے اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہتا ہے، اللہ اسے اِدھر اُدھر دیکھنے اور دنیا دارانہ لائین اختیار کرنے سے بچاتا ہے، یہ احتیاط ہی صوفی کو اللہ کی حفاظت میں دینے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

سوال: کچھ مزید تفصیل بتانا پسند کرینگے؟

جواب: اس سے زیادہ دوسری تفصیل کیا ہوسکتی ہے، ''تصوف'' تو دراصل فرد کا ذاتی مشاہداتی عمل ہے، جس سے فرد لگاتار اندر میں غوطہ زن ہوکر، اپنے نفس کا محاسبہ اور تزکیہ کرتا رہتا ہے، اس محا سبے کے عمل سے وہ موت تک فارغ نہیں ہوتا، وہ مسلسل اپنا احتساب کرتا رہتا ہے، جب بھی اس نے اپنا احتساب چھوڑا، اسی دن وہ نیچے گرنا شروع ہوجاتا ہے۔ تصوف میں ''دعویٰ'' صوفی کیلئے زوال کا ذریعہ بن جاتی ہے، اپنے مجاہدوں پر ناز کرنے سے بھی صوفی ڈرتا رہتا ہے، کہ کہیں محبوب حقیقی کو اس کی یہ ادا پسند نہ آئے، اور حاصل شدہ بیش بہا دولت سلب نہ ہوجائے۔

سوال: آپ نے کہا ہے کہ آپ سترہ برس تک مسلسل سلوک کے سفر میں چلتے رہے، لیکن اس دوران سندھی اور اردو زبان میں آپ کی کئی کتابیں شایع ہوئیں، آپ کی ان اہم علمی کتابوں کی اشاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنا زیادہ وقت کتابوں پر صرف کیا ہے، کتابوں کے تیاری کے ساتھ ساتھ آپ ۱۹۹۲ع سے ۸۰ صفحات پر مشتمل ماہنامہ سندھی رسالہ ''بیداری'' بھی شایع کرتے رہے؟

جواب: ہمارا یہ سارا کام اللہ کے ذکر اور اسکی محبت کی راہ میں چلنے کی برکت سے ہے، اور سلوک میں چلنے کا نتیجہ ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ جب کوئی باصلاحیت اور علمی مزاج رکھنے والا فرد راہ سلوک میں چلتا ہے تو اسکے علم اور وقت میں کافی برکت

آجاتی ہے، اور اللہ کی مدد اور تائید کی نئی نئی صورتیں اس کے سامنے آنے لگتی ہیں کہ اپنے کام کو دیکھکر فرد خود حیرت زدہ ہوجاتا ہے کہ یہ تو میرے علم، میری ذہنی صلاحیت اور توانائی سے زیادہ کام ہے۔

سوال: کیا سلوک کے سفر کے دوران سالک کا لوگوں سے تعلق متاثر نہیں ہوتا اور اس کے ضروری اور شخصی کام متاثر نہیں ہوتے، اپنے ذاتی تجربے کے حوالے سے بتائیں؟

جواب: سلوک میں عام طور پر لوگ جزوی طور پر چلتے ہیں، یعنی ذکر وفکر کو بمشکل ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ وقت دیتے ہیں، مصروف لوگوں، (کاروباری اور ملازمت پیشہ) لوگوں کا سلوک یہی ہے، پوری استقامت کے ساتھ ذکر کو اتنا وقت دینے سے بھی انشا اللہ تعالیٰ چند سالوں میں فرد کی اچھی اصلاح ہوجاتی ہے، البتہ باقاعدہ سلوک میں چلنے والے افراد بہت کم ہوتے ہیں، ہزار میں بمشکل دو چار افراد، ایسے افراد سے آگے چل کر دوسروں کی تربیت کا کام لینا مقصود ہوتا ہے۔ ایسے سالکوں کو درمیانی عرصے میں کم ملنے اور کم بولنے کے اصولوں پر سختی سے عمل کرنا پڑتا ہے، ایسا کرنے سے ''توجہ الی اللہ'' کے ملکے کے راسخ ہونے میں مدد ملتی ہے۔

سوال: آپ کا تصنیف اور تالیف کا کام کب شروع ہوا؟

جواب: ۱۹۷۰ع میں ممتاز دانشور پروفیسر کریم بخش نظامانی صاحب کے ساتھ مل کر ہم نے ''مسلم پبلشنگ ہاؤس'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، اس ادارے کی طرف سے پروفیسر موصوف کی اسی سال ''(پرانے) سوشلسٹ کی ڈائری'' اور ''لیلا کے خطوط'' کے نام سے دو کتابیں شایع ہوئیں، موصوف کمیونسٹ رہ چکے تھے، ان کتابوں

میں انہوں نے اسلام کے متعلق کمیونسٹ حکمتِ عملی، اور ان کے کام کی طریقہ کو بے نقاب کیا ہے، اس کے بعد اس ادارے سے میری دو کتابیں ''مٹ مئی جا نہ تھیا'' اور، ''سندھ میں بے چینی کے اسباب'' کے نام سے سندھی زبان میں کتابیں شایع ہوئیں، جو ۱۹۷۲ع اور ۱۹۷۴ع میں شایع ہوئیں، اس کے بعد میری کتابوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا، جس میں ''ہمارے سیاستدان'' ''ذوالفقار علی بھٹو ، عروج وزوال کی کہانی'' ''پاکستان کا المیہ، اسباب اور حل'' ''روسی سامراج عالم اسلام کیلئے چیلنج '' یہی کتاب بعد میں ''پرڈیھی سامراج عالم اسلام کے لئے چیلنج'' کے نام سے سندھی زبان میں بھی شایع ہوئی۔

میری یہ کتابیں ۱۹۸۰ع تک چھپ چکی تھیں، ''ذوالفقار علی بھٹو ، عروج وزوال کی کہانی'' کے کئی ایڈیشن شایع ہوئے، روسی سامراج والی کتاب سات ہزار کی تعداد میں چھپی، ۸۳ء میں میری دوسری اہم کتاب ''پرین جی پچار'' شایع ہوئی، جس میں سندھ میں آزادی کی تحریک میں اہم کردار ادا کرنے والی علمی، سیاسی اور صحافتی شخصیتوں کے کردار پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب سندھ میں تحریک آزادی کے پچاس، ساٹھ سالہ جدوجہد کی کہانی تھی، اُس دور کے سندھی اخبارات کے رکارڈ کو بنیاد بنا کر ایک مکمل تحقیقی کام کیا گیا تھا، جو آنے والے دور کے لئے مستند ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، یہ کتاب اردو میں لکھی گئی تھی، جس کا ترجمہ محترم انور جوکھیو صاحب نے کیا، اس کتاب کے تین ایڈیشن شایع ہوئے، یہ کتاب ۱۹۸۳ع میں شایع ہوئی، اس کے بعد ۱۹۸۴ع میں ایک اہم کتاب ''جدید سندھ کے مسائل اور ان کا حل'' کے نام سے شایع ہوئی، جس میں سندھ کے وہ مسائل، جس کی وجہ سے قوم پرستی کی تحریک کو فروغ ملا،

ان کا تفصیلی جائزہ لیکر ان کا حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سندھ کے علمی حلقوں میں اس کتاب کو بہت پسند کیا گیا۔

۱۹۸۴ع میں دو اہم کتابیں شایع ہوئیں ایک ''تنقیدیں اور تجویزیں'' کے نام سے، جو ممتاز صحافی مولانا خیر محمد نظامانی صاحب کے پچاس سالہ اخباری ادارتی نوٹوں کے مجموعے پر مشتمل تھی، اس کتاب میں شامل مضامین آج بھی قومی اور ملی حالتوں اور کفر کی عالمی طاقتوں کی طرف سے عالم اسلام کو درپیش چیلنج کے نقطۂ نگاہ سے اہم ترین کتاب نظر آتی ہے، مولانا خیر محمد نظامانی کو اللہ تعالیٰ نے غیرمعمولی ذہانت اور بصیرت عطا کی تھی، اور انہیں سندھی زبان پر بھی عبور تھا۔

موصوف اگر مستقل مزاجی سے لکھتے تو سندھی زبان میں لادین فکر کے مقابلے کی بہتر صورت پیدا ہوسکتی تھی، لیکن استقلال کی کمی کی وجہ وہ اس سلسلے میں کوئی خاص کام نہ کر سکے۔

سندھی زبان میں ہمارا باقائدہ نظریاتی، فکری اور علمی کام، جو پوری منصوبہ بندی سے شروع ہوا، وہ جنوری ۱۹۸۵ع سے ہوا، کمیونزم، قوم پرستی، ترقی پسندی، سیکیولرزم اور اسلام کے نظریے سے متعلق علمی اور استدلالی طور پر ہر مہینے ایک کتاب شایع ہوتی رہی، جو سندھ کے علمی اداروں کے پروفیسروں، قوم پرست اور ترقی پسند دانشوروں کو ہر مہینے باقاعدہ اعزازی طور پر بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ آٹھ ، دس برس کے اندر ان موضوعات پر ایک سو سے زیادہ کتابیں شایع ہوئیں، اور علمی ذوق رکھنے والے افراد تک پہنچتی رہیں، الحمدللہ یہ کام آج تک کسی حد تک جاری ہے۔

سوال: کیا آپ اپنے اس فکری اور علمی کام کے اہداف بتائینگے؟

جواب: پہلا ہدف ترقی پسند اور سیکولر فکر کی روک تھام تھا، تاکہ ہمارا روایتی مذہبی معاشرہ جدید فکر کی تیز لہروں میں بہہ جانے سے بچ سکے، دوسرا ہدف یہ تھا کہ ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کی اسلامی نقطۂ نظر سے ذہنی اور علمی تربیت ہو، تاکہ وہ سندھی زبان میں اسلامی فکر کو اپنے اپنے حلقے میں پورے اعتماد اور جرئت سے پیش کرسکیں۔ تیسرا ہدف یہ تھا کہ ایسے لکھنے والے تیار ہوں، جو علمی محاذ پر اسلامی اعتبار سے کام کرسکیں۔ چوتھا ہدف یہ تھا کہ اپنی دینی، اخلاقی اور روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ، اپنے دوست احباب کی بھی تربیت ہو۔

سوال: کیا آپ کو مقاصد میں کامیابی حاصل ہوئی؟

جواب: الحمدللہ، دینی اعتبار سے اپنی ذمیداریاں ادا کرنے کی حتی الامکان کوشش ہوئی، کافی باصلاحیت افراد ملے، اور جدید فکر کے مقابلے میں مارکیٹ میں اسلامی فکر کو سامنے لایا گیا، جس کے کچھ مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

سوال: کیا آپ ایسے افراد کے نام بتا سکتے ہیں، جو آپکے قریب آئے، اور آپ نے ان سے کام کی توقعات بھی وابستہ کیں؟

جواب: ایسے افراد میں عبدالخالق شیخ صاحب، نذیر احمد مہر صاحب، حفیظ اللہ عباسی صاحب، عنایت اللہ مہر صاحب، غلام عباس مہر صاحب، حماد اللہ بھٹو صاحب، مولوی نیک محمد صاحب، ڈاکٹر عبدالحفیظ سموں صاحب، عبدالقدیر کانجوں صاحب اور عبدالجبار عبد صاحب جیسے کافی دوست ہیں۔

سوال: ان دوستوں نے آپکا کہاں تک ساتھ دیا؟

جواب: ان میں کچھ دوست تو اپنی جگہ پر کام کررہے ہیں، جو بڑی خوشی کی بات

ہے، لیکن کافی دوست ساتھ چھوڑ گئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ، موجودہ دور میں خوشحال معاشی زندگی، بہترین گاڑی، شاندار بنگلہ، اور زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کا جو کلچر، مغرب سے ایک طوفان کی صورت میں ہماری زندگیوں میں آکر شامل ہوا ہے، اس طوفان میں عام طور پر مجھ جیسے سینکڑوں افراد بہہ گئے ہیں، اب زندگی کا سب سے بڑا ہدف ''خوشحال معاشی زندگی'' کا حصول بن گیا ہے، اسلئے ایسے باصلاحیت افراد کم ہیں، جو اپنی ذاتی اصلاح اور دعوتی کام کو زندگی میں اولین ترجیح دیتے ہوں۔

بعض نوجوانوں کے متعلق یہ توقع تھی کہ، وہ زندگی بھر ساتھ دینگے، لیکن مادیت کی تیز لہروں نے ایسے ذہین نوجوانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر بھی اللہ کا شکر ہے کہ نئے، نئے افراد ملتے رہتے ہیں۔

سوال: آپ نے سیکولرزم کے بڑھتے ہوئے رجحان کا ذکر کیا ہے، ملک میں اور خاص طور پر سندھ میں سیکولرزم کے ان بڑھتے ہوئے اثرات کیلئے تصوف کی زیادہ ضرورت ہے یا علمی نوعیت کے اداروں کی؟

جواب: تصوف باطن کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے، اس لئے تصوف سے وابستہ بزرگ اگر افراد کی صحیح تربیت کے کام کو اولین ترجیح دیں، اور تصوف میں اپنے ذاتی مقاصد کو پس پشت ڈال کر خلوص سے انکا تزکیہ کریں تو اہل تصوف سیکیولرزم کی روک تھام کیلئے اہم کردار اور کر سکتے ہیں۔

جدید چیلنج کا سامنا کرنے کیلئے علمی اداروں کی بھی ضرورت ہے، اور ایسے اہل علم کی بھی، جو سیکولرزم اور ترقی پسند فکر کی نوعیت کو سمجھکر، اسلامی تعلیمات کو جدید ذہنی سطح کے مطابق پیش کرسکیں، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو علماء کرام کی ذہنی سطح

جدیدیت کے چیلنج سے مطابقت نہیں رکھتی، ان پر فتویٰ والا رنگ غالب ہے، جدید نسلوں کو سنبھالنے اور اسلام پر ان کے اعتماد کو بحال کرنے کیلئے فتویٰ کا انداز، جدید فکر سے متاثر افراد کو مزید دور کرنے کا باعث ہے۔

ان حالات میں جدید نوعیت کے علمی کام کی سخت ضرورت ہے، جسکے ذریعے اسلام کے حق میں بہترین علمی لٹریچر تیار کرکے، اعزازی طور پر پھیلایا جائے، ساتھ ہی اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ دینی طبقے اپنے دائراتی خول سے بلند ہو کر، اس قسم کے لٹریچر کا مطالعہ کریں اور موجودہ اور آنے والی نسلوں کو دوستانہ ماحول میں سیکیولر فکر سے بچانے کی کوشش کریں۔

سوال: اس سلسلے میں آپکے ادارے کی سندھی زبان میں شایع شدہ کتابیں کافی اہم ہیں، لیکن بہت ساری کتابوں کے مطالعے کا لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے، آپ چند اہم کتابوں کے نام تجویز کریں، جن سے جدید فکر کی نوعیت کو سمجھنے میں، اور اسلام پر اعتماد بحال ہونے میں مدد ملے۔

جواب: الحمدللہ، اس سلسلے میں ہمارے ادارے نے ۳۵ سالوں میں کافی کتابیں شایع کی ہیں، جن میں سے کئی کتابیں اب ہمارے پاس نہیں رہیں، لیکن جو موجود ہیں، ان میں سے کچھ اہم کتابوں کی نشاندہی کی جارہی ہے ، (۱) ترقی پسند فکر کا تنقیدی مطالعہ (۲) جیسا میں نے دیکھا (۳) سیکیولرزم اور عقلیت پسندی (۴) تھیاکریسی (۵) مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب، تقابلی مطالعہ۔ (۶) اسلام مسلمان اور قوم پرستی، (۷) اسلام، کائنات اور قانونِ فطرت (۸) ہندو دانشور، اسلام کی شاہراہ پر (۹) قومیت، ایک تجربہ، ایک مطالعہ (۱۰) کمیونسٹ منشور (۱۱) خدا، اسلام اور جدید سائنس (۱۲) حق

کا پیغام (۱۳) اسلامی منشور (۱۴) اسلامی فکر کی نئی تشکیل۔ (۱۵)اسلام میں علاقائی حقوق کا تصور (۱۶) عالمی امن کا اسلامی منشور (۱۷) نوجوانوں کے مسائل اور ان کا حل۔ (۱۸) پرویزی فکر، ایک مطالعہ، ایک جائزہ۔ (۱۹) جدید علم کا چیلنج ۔

سوال: سوشل میڈیا اس وقت کروڑوں افراد کے خیالوں میں فساد پیدا کرنے اور اسلام کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے، کیا سوشل میڈیا کو صحیح دینی فکر کے فروغ کے مقصد کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے؟

جواب: سوشل میڈیا کا محاذ، انتہائی اہم محاذ ہے، اسے اسلام کے فروغ کیلئے استعمال کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے، لیکن اس کے لئے صحیح، باصلاحیت اور ایمان و یقین سے سرشار دینی اسکالرز کی ضرورت ہے، جو حکمت وفراست سے کام لیکر اسلام اور امت پر ہونے والے ہر اعتراض کا ٹھنڈے دل ودماغ سے مثبت جواب دیں اور مثبت فکر پیش کریں۔ اس سلسلے میں ہمارا ایک باصلاحیت سندھی دانشور چند سالوں سے کام کررہا ہے، اس کا کام بہت کارآمد ہے۔ جس سے سندھ کا سیکیولر حلقہ بہت پریشان ہے، ہمارا یہ اسکالر دوست کافی لوگوں پر اثر انداز بھی ہوا ہے، بے شمار افراد ان کا پروگرام دیکھ رہے ہیں۔ وہ اسلام کے نظریاتی مقصد کیلئے سوشل میڈیا کے محاذ کو بہتر طور پر استعمال کررہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مزید ایسے باصلاحیت افراد سامنے آئیں۔ آج کے دور میں سوشل میڈیا پر کام کرنے کیلئے ''تعلق باللہ'' کی زیادہ ضرورت ہے، اس کے بغیر حکمت اور استقامت کے ساتھ کام کرنا مشکل ہے، بلکہ فوائد سے زیادہ فرد کی اپنی دینی حالت کے کمزور ہوجانے کا خدشہ ہے۔

سوال: آپ نے تصوف اور ذکر وفکر کے ذریعے افراد کا ایک طبقہ پیدا کر لیا

ہے، کیا ان میں جدیدیت کے چیلنج کا سامنا کرنے والے افراد بھی تیار ہوئے ہیں؟

جواب: ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ ذکر وفکر کے ساتھ دوستوں میں جدید دور کے چیلنج کا شعور بھی پیدا ہو۔ ہمارے ہاں ذکر وفکر کا ہفتہ وار حلقہ ہوتا ہے، اس میں ذکر کے ساتھ ساتھ تقریبا ہر موضوع پر گفتگو ہوتی ہے، خصوصا موجودہ دور میں سیکیولر نقطۂ نگاہ کے عام ہوجانے اور مذہب کو زندگی کے خاص دائرے تک محدود رکھنے، عملی، اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی نفسی خواہشوں کے مطابق تشکیل، اور اس قسم کے رجحانات کے خلاف بہتر ذہن سازی کی کوشش ہوتی ہے۔ تصوف اور ذکر وفکر کی طرف باصلاحیت افراد کا رجوع کم ہونے کی وجہ سے ہمیں اس سلسلے میں کوئی خاص کامیابی تو حاصل نہیں ہوسکی ہے، لیکن الحمدللہ، پچھلے دس، پندرہ سالوں میں کام کے کچھ ساتھی مل گئے ہیں۔ پچیس، تیس سال پہلے کے ساتھیوں میں اکثریت ان کی تھی، جو مادیت کے طوفانی ریلے میں بہہ گئے، لیکن دس، پندرہ برس سے بعض دوست ایسے ملے ہیں، جو روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ ذہنی اور علمی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی بہتر کام کر رہے ہیں۔

سوال: صحافت میں آپکا کن اخبارات اور رسائل سے تعلق رہا؟

جواب: روزانہ ''عبرت'' میں پانچ، سات ماہ تک، روزنامہ ''الوحید'' سے اس کے اجراء سے لیکر، بند ہونے تک (یعنی جنوری ۱۹۷۰ع سے اپریل ۱۹۷۱ع تک) روزنامہ ''جسارت'' کراچی سے جنوری ۱۹۷۱ع سے دسمبر ۱۹۸۳ع تک) درمیاں میں بھٹو صاحب کے دور حکومت میں ''جسارت'' اخبار تین، چار سال تک بند رہا، اسکے بعد لاہور کے ''بادبان'' اور ''لیل ونہار'' سے میں وابستہ رہا۔ ۱۹۸۳ع میں جسارت کو چھوڑنے کے بعد چار سال تک روزنامہ ''جنگ'' سے وابستہ رہا، میں ان سارے

اخبارات میں مضمون نگار کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ جنگ میں اعزازی طور پر لکھتا رہا، باقی اخبارات ورسائل میں ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے کام کیا ہے۔

سوال: صحافت سے اتنے عرصے تک وابستگی کے دوران آپ کو کچھ اہم تجربات اور مشاہدات ہوئے ہونگے، ان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: سب سے پہلے تجربہ مولانا خیر محمد نظامانی کے مزاج کا ہوا۔ مولانا ''الوحید'' کے اجراء سے سات آٹھ ماہ پہلے جماعتِ اسلامی صوبۂ سندھ کے دفتر میں رہے، دفتر میں اس وقت باقاعدہ کوئی معاون دفتر نہیں تھا۔ الحمدللہ، مجھے مولانا کی ہر قسم کی خدمت کرنے کا موقعہ ملا، جسے میں اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں، لیکن مولانا اپنے نقطۂ نگاہ کے معاملے میں مزاجا سخت تھے، وہ جس معاملے میں بھی کوئی رائے قائم کرتے تھے، اس رائے پر اٹل رہتے تھے، اخبار کے مالکان کی الگ رائے ہونے کی وجہ سے وہ اخبار سے کنارہ کش ہوجاتے، مولانا ساری زندگی اسی پالیسی پر عمل پیرا رہے، ''الوحید'' اخبار کی سال بھر کی ادارت کے دوران مولانا نے دوبار اخبار کی ادارت سے استعفیٰ دیا، بڑی مشکل سے مولانا کو منایا گیا۔

''الوحید'' کے بعد میرا تعلق روزنامہ ''جسارت'' کراچی سے ہوا، اس وقت جسارت کے ایڈیٹر عبدالکریم عابد صاحب تھے، جو دانشور صحافیوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ایک صوفیانہ مزاج رکھنے والے فرد تھے، انتہائی سادہ، لیکن ذہانت سے پُر، فکر میں پختگی، اور ہر موضوع پر لکھنے کے معاملے میں سارے ملک کے صحافیوں سے منفرد تھے۔ پڑھنے والے انکے مضامین اور اداریوں کا شدت سے انتظار کرتے تھے، سندھ کے خاص حالات کی وجہ سے، مجھ جیسے لکھنے والے کو آگے بڑھانے میں انہوں نے

خاص دلچسپی لی۔ میں نے ۱۹۷۷ع تک یہ کوشش کی کہ عابد صاحب کے مضامین کو فائل میں محفوظ رکھا، انکے لکھے ہوئے مضامین کو وقتاً فوقتاً پڑھکر، ان سے اپنے لکھنے کے انداز اور طرز تحریر کو سنوارتا تھا، جب بھی میں کراچی جاتا تو ان کے گھر میں قیام کرتا تھا، گھر میں ایک کمرہ مہمانوں کیلئے مختص تھا، انکی گفتگو سے بھی کام کے نکتے ملتے تھے۔

جسارت میں ۱۹۷۱ع کے آخر میں انہوں نے محسوس کیا کہ ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا کام کرنا مشکل ہے تو وہ استعفیٰ دیکر گھر بیٹھ گئے، استعفیٰ کے دو اسباب تھے، ایک تو جماعت اسلامی نے مشرقی پاکستان میں فوج کا ساتھ دیکر بڑی سیاسی غلطی کی تھی، دوسرے یہ کہ، محمد صلاح الدین، جو بڑے صحافی تھے، ان کے ساتھ مختلف معاملات میں ان کا اختلاف تھا۔

استعفیٰ دینے کے بعد جماعت اسلامی کے ذمہ داروں نے بڑی مشکل سے انہیں ''جسارت'' میں مستقل طور پر مضمون لکھنے پر آمادہ کیا۔ ''جسارت'' کی بندش کے بعد وہ، عبدالقادر حسن صاحب کے ہفتہ وار رسالے ''افریشیا'' کے مدیر مقرر ہوئے، یہ رسالہ لاہور سے شایع ہوتا تھا۔ مجھے بھی انہوں نے ''افریشیا'' میں لکھنے پر آمادہ کیا، لیکن ہفتہ روزہ افریشیا بھی سال ڈیڑھ میں بند ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۷۷ع تک عابد صاحب کے ساتھ میں نے مجیب الرحمان شامی صاحب کے رسالے ''لیل ونہار'' میں لکھنا شروع کیا۔

عبدالکریم عابد صاحب، جہاں علم ودانش میں ایک ممتاز شخصیت تھے، وہاں ان کی شخصیت میں درویشی کے اجزاء بھی موجود تھے۔ جس کا اندازہ درج ذیل واقعات سے لگایا جا سکتا ہے، موصوف کے والد صاحب حیدرآباد دکن میں کاروباری شخصیت تھے، وہ

اپنے پیچھے کافی جائداد چھوڑ گئے، ان کی اولاد، جو حیدرآباد دکن میں رہتی تھی، انہوں نے یہ ساری جائداد ان کو دیدی، اور اپنے فرزند کو تاکید کردی کہ، میری موت کے بعد اپنی پھوپھی سے جائیداد میں حصیداری کا مطالبہ نہ کرنا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ عابد صاحب نے لاہور میں ایک عوامی نوعیت کی کالونی میں مکان لیا تھا، سلمان عابد صاحب جو ان کے فرزند ہیں، انہوں نے ان سے کہا کہ میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ میں اچھی جگہ بہتر مکان لینا چاہتا ہوں، عابد صاحب نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔

عابد صاحب اپنی عمر کے آخری ۲۲ سالوں میں گلے کے کینسر کے مرض میں مبتلا رہے، جماعت اسلامی پاکستان کے اس وقت کے ناظم نشر واشاعت چوہدری صفدر صاحب نے اپنے دوستوں سے چندہ جمع کرکے، عابد صاحب کا لندن کے ہسپتال میں علاج کروانے کا انتظام کیا، سارا انتظام کرنے کے بعد انہوں نے عابد صاحب کو اس کی اطلاع دی، عابد صاحب نے ان کی یہ آفر قبول نہ کی اور کہا، ''ملک کے غریب لوگوں کے پاس تو مقامی ہسپتال میں بھی اس قسم کی بیماریوں کے علاج کی سہولت اور وسائل موجود نہیں ہیں، اور میں لندن میں اپنا علاج کرواؤں، ایسا کرنا میرا دل گوارہ نہیں کرتا۔''

آج کی صحافت میں اس قسم کے لوگ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔

''جسارت'' میں عابد صاحب کے استعفیٰ کے بعد جسارت کے مدیر محمد صلاح الدین صاحب رہے، صلاح الدین موصوف اپنی ذات میں انجمن تھے، انتہائی متحرک، فعال، جرئت مند اور حمیت دین رکھنے والے۔ میں نے ۱۹۸۳ع کے شروع تک محترم

صلاح الدین صاحب کے ساتھ کام کیا، جسارت کا دوبارہ اجراء بھٹو صاحب کی حکومت کے خاتمے اور ضیاء الحق صاحب کے برسراقتدار آنے پر ۱۹۷۷ع میں ہوا، صلاح الدین صاحب، ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کو ملک کیلئے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ اس لئے بھٹو اور پیپلز پارٹی سے دشمنی ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ اس کے علاوہ موصوف علاقائی مسائل پر لکھنے کے حامی نہیں تھے۔

۱۹۸۲ع میں میرا یہ ذہن بن چکا تھا کہ چھوٹے صوبوں بالخصوص سندھ کو مطمئن کرنے کیلئے اہل سندھ کے علاقائی مسائل کو اہمیت دینا ضروری ہے، اس موضوع پر میں نے ۱۹۸۲ع سے جسارت میں مضامین لکھنے شروع کئے، سندھ کے بارے میں میرے نئے موقف کی وجہ سے صلاح الدین صاحب، مضمون تو کسی نہ کسی طرح شایع کرتے رہے، لیکن آخر میں موصوف نے مجھے لکھا کہ، آئندہ آپکے مضامین شایع نہیں ہوں گے، اس لئے کہ لگتا ہے کہ آپ ''سندھو دیش'' تحریک سے مرعوب ہو چکے ہیں۔

محترم صلاح الدین صاحب نے سندھو دیش تحریک سے مرعوب ہونے کی جو بات خط میں لکھی، ان کی یہ بات تو صحیح نہیں تھی، البتہ اس کو میری حکمت عملی کی غلطی کہا جا سکتا ہے، لیکن الحمدللہ، میں جلد ہی علاقائی مسائل کی سوچ سے بلند ہو کر، سندھی زبان میں اسلام کے علمی اور فکری کام کی طرف آ گیا، اور میری اس حکمت عملی نے نظریاتی کام میں مجھے بہت فائدہ پہنچایا، اسکے بعد جلد ہی محمد صلاح الدین صاحب اور محمود اعظم فاروقی صاحب (جو جسارت کی انتظامیہ کے نگران اعلیٰ تھے) ان کے درمیاں اختلافات بڑھ گئے۔ صلاح الدین صاحب پیپلز پارٹی سے اختلاف کے معاملے میں بہت آگے بڑھ چکے تھے، جبکہ، جماعتِ اسلامی کراچی کی قیادت، جس میں محمود اعظم

فاروقی صاحب اور پروفیسر عبد الغفور احمد صاحب شامل تھے، انکا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ پیپلز پارٹی کی اتنی مخالفت صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ قومی نوعیت کی پارٹی ہے، قوم پرستی کی تحریکوں کے مقابلے میں پیپلز پارٹی ملک کیلئے غنیمت ہے، اس اختلاف کی وجہ سے محترم صلاح الدین صاحب کو جسارت کو چھوڑنا پڑا، اور اس کے بعد جلد ہی موصوف نے ''تکبیر'' کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ جاری کیا، جو بہت ہی مقبول ہوا۔

جسارت کی انتظامیہ نے عبدالکریم عابد صاحب کو لاہور سے بلاکر مدیر کی حیثیت سے انکی خدمات حاصل کیں۔

محمد صلاح الدین صاحب نے اختلافِ رائے کے باوجود مجھے تکبیر میں لکھنے کے لئے کہا، لیکن سندھی زبان میں علمی کام کی وجہ سے میں نے ان سے تکبیر میں لکھنے سے معذرت کر لی۔ عبدالکریم عابد صاحب کے جسارت میں دوبارہ آنے کی وجہ سے، میں نے سال بھر مزید، ''جسارت'' میں کام کیا، عبدالکریم عابد صاحب نے میری نئی اردو کتاب ''پاکستان میں قومیتوں کے مسائل اور ان کا حل'' میں شامل کئی مضامین جسارت میں شایع کئے۔

محمد صلاح الدین صاحب کی شخصیت میں اخلاص، جذبۂ جہاد اور حمیتِ دین کے اجزاء کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ اس وقت کے صدر ضیاء الحق سے قریبی تعلقات ہونے کے باوجود انہوں نے ان سے کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ، ''جسارت'' میں شایع شدہ میرے مضامین میں سے کچھ مضامین انہیں بہت پسند آئے، انہوں نے کہا کہ آپ ان مضامین کو کتابی صورت میں شایع کریں۔ اس کے اخراجات میں ادا کرونگا۔ میں نے کتاب شایع کردی، لیکن

موصوف پیسے نہ دے سکے۔ جسارت کے ایک قاری جو ان کے دوست بھی تھے، میں صلاح الدین صاحب سے ملنے گیا تو موصوف نے اپنے دوست قاری سے کہا کہ انہوں نے میرے کہنے پر کتاب شایع کی ہے، ان کی کچھ مدد کریں۔

''ایم آر ڈی'' تحریک نے پنجاب کے علمی حلقے میں پاکستان کے مستقبل کے متعلق بڑی تشویش پیدا کردی تھی، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ''محاضرات قرآنی'' کے نام سے، سال میں دو تین دنوں کیلئے لاہور میں پروگرام رکھتے تھے، انہوں نے ۱۹۸۳ع کے آخر میں ایک دن کا پروگرام سندھ کے حوالے سے رکھا، سندھ سے موصوف نے محمد صلاح الدین صاحب، مجھے، ''الشریعت'' سندھی کے مدیر مولانا عبدالوھاب چاچڑ صاحب اور آغا نور محمد پٹھان صاحب، جو (اسلامی جمعیۃ طلبہ سندھ کے معتمد یا جنرل سیکریٹری رہ چکے تھے) ہم تینوں کو انہوں نے دعوت دیکر بلایا، اس پروگرام میں آغا نور محمد پٹھان صاحب نے اپنی تقریر میں محمد صلاح الدین صاحب پر سخت تنقید کی، کہ موصوف سندھ دشمنی میں بہت آگے نکل چکے ہیں، حالانکہ انہیں سندھ سے ہونے والی زیادتیوں پر سندھ کا ساتھ دینا چاہئے تھا۔ آغا صاحب کی تنقید پر محمد صلاح الدین صاحب نے مجھے خط لکھا کہ، آغا نور محمد صاحب مجھ سے ناراض ہیں، آپ میری طرف سے ان سے معافی طلب کریں، کسی دیندار نوجوان کو ناراض کرنا، میرے لئے باعث اذیت ہے۔

غالبا ۱۹۸۸ع کا ذکر ہے کہ، محترم صلاح الدین صاحب اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درمیاں پیپلز پارٹی، عورت کی سربراہی اور کچھ دوسرے مسائل پر سخت اختلافات پیدا ہوگئے۔ محترم محمد صلاح الدین صاحب نے ''تکبیر'' میں محترم ڈاکٹر اسرار

احمد صاحب پر سخت تنقید کی، اور ان مسائل پر اپنے موقف کو شد ومد سے پیش کیا، اس کے جواب میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تفصیلی مضمون لکھا، جو ماہنامہ ''میثاق'' کا پورا نمبر بن گیا، ڈاکٹر صاحب کی طرف سے تنقید میں جو لہجہ اختیار کیا گیا تھا، وہ غیرمعمولی طور پر سخت تھا، اس بحث کی وجہ سے اسلام دوست علمی حلقے میں کافی تشویش پیدا ہوگئی۔ محترم صلاح الدین صاحب نے ''تکبیر'' میں اعلان کیا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مضمون کے جواب میں تفصیلی مضمون ''تکبیر'' کے آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمایئے۔ میں نے محترم صلاح الدین صاحب کو خط لکھا کہ آپ برائے کرم صبر سے کام لیں، اس مضمون کو شایع کرنے کی بجائے یہ نوٹ شایع کریں کہ، ''ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ایک فاضل شخصیت ہیں، اور دین کی بہت خدمت کررہے ہیں، میں موصوف سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتا، ڈاکٹر صاحب نے میرے بارے میں جو زبان اختیار کی ہے، اس کے لئے میں انہیں دل سے معاف کرتا ہوں۔''

محترم صلاح الدین صاحب نے میرے خط کا خیرمقدم کیا اور اس خط کا حوالہ دیکر ''تکبیر'' میں لکھا کہ، ''میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جیسی علمی شخصیت سے بحث میں پڑنا نہیں چاہتا، تکبیر میں اعلان شدہ مضمون شایع نہیں کیا جارہا، اس کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔''

بڑے لوگوں کی یہ بڑی باتیں ہیں، جس کی آجکل کے لکھنے والوں سے توقع کرنا مشکل ہے۔

محمد صلاح الدین صاحب ہفتہ روزہ تکبیر میں ایم کیو ایم کی ملک دشمن سرگرمیوں کے خلاف سخت لکھتے تھے، یہ وہ دور تھا، جب ایم کیو ایم خوف اور دہشتگردی کی علامت

بن چکی تھی، اس وقت ان کو سخت تنقید کا نشانہ بنانا اور ان کے پول کھولنا، یہ محمد صلاح الدین جیسے مجاہد کا ہی کارنامہ تھا، ایم کیو ایم نے اسی جرم میں انہیں شہید کیا۔

محمد صلاح الدین صاحب نے روزانہ اخبار کے اجراء کا منصوبہ بنایا تھا، جسے ان کی شہادت کے بعد، انکی اکلوتی بیٹی کے شوہر رفیق افغان صاحب نے، ''امت'' اخبار کی صورت میں جاری کیا۔

۱۹۸۳ع کے آخر، یا ۱۹۸۴ع کے شروع میں میں نے جسارت کی ملازمت چھوڑ دی، ''جنگ'' کے بانی میر خلیل الرحمٰن صاحب نے مجھے ''جنگ'' میں لکھنے کیلئے خط لکھا، میں نے جنگ میں اعزازی طور پر لکھنا شروع کیا، تاکہ قومی صحافت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح میرا تعلق قائم رہے۔

لیکن میری سرگرمیوں کا اصل ہدف سندھی زبان میں علمی اور فکری لٹریچر رہا، چونکہ ۱۹۸۴ع میں میرا ایک نقشبندی سلسلے کے بزرگ سے تعلق قائم ہو چکا تھا اور ذہنی طور پر میں تصوف کی فکر کو اختیار کر چکا تھا، اسلئے جنگ میں قومی مسائل پر لکھنے کے ساتھ ساتھ جدید دور میں اسلامی فکر کی پیشکش کے موضوع پر میرے کافی مضامین شایع ہوئے، جو بعد میں ''جدید دوَر میں اسلامی فکر''، ''پاکستان میں اصلاح کا لائحہ عمل'' اور ''قومی تشکیل نو'' کے ناموں سے کتابی صورت میں شایع ہوئے۔

فکری اعتبار سے میں نے جو توازن اور وسعت عبدالکریم عابد صاحب کی شخصیت میں دیکھی، ایسی وسعتِ فکری، کسی اور میں نظر نہیں آئی۔ ایک طرف تو وہ آخر وقت تک جماعت اسلامی کے اخبارات سے وابستہ رہے، دوسری طرف وہ لاہور کے سیکیولر قسم کے اخبارات میں بھی مضامین لکھتے رہے، جن میں بڑی حکمت کے ساتھ اپنا موقف

پیش کرتے رہے، اسکے ساتھ ساتھ انہیں جماعت اسلامی کی فکر اور سیاسی حکمتِ عملی میں موجود غلطیوں کا بھی اندازہ تھا اور تجزیہ کرنے کا بھی پورا شعور حاصل تھا، ایک دفعہ کہنے لگے کہ ''مولوی بیچارہ دائراتی خول میں بند ہوگیا ہے، اسلئے اسکی سوچ میں محدودیت آ گئی ہے، اور وہ معاشرے میں متنازع بن گیا ہے۔ یہی سوچ کی محدودیت جماعت اسلامی میں بھی پیدا ہوچکی ہے، اسی لئے جماعت کی، محدود دائرے سے بلند ہو کر سوچنے کی صلاحیت متاثر ہو چکی ہے، جماعتی دائروں میں محصور ہوجانا بہت بڑے نقصان کا باعث بنتا ہے۔

میرا اردو ڈائجسٹ کے مدیر الطاف حسین قریشی اور مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے ساتھ بھی کافی تعلق رہا، پاکستان میں سوشلزم کے نام پر ابھرنے والی تحریک کی روک تھام میں ان دونوں صاحبان نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ محمد صلاح الدین صاحب۔ الطاف حسین قریشی صاحب اور شامی صاحب، یہ تینوں ممتاز لکھنے والے دوستی کے گہرے رشتے میں بھی منسلک تھے۔ ان تینوں کے اس وقت کے صدر ضیاء الحق صاحب سے گہرے مراسم رہے، بھٹو صاحب کے دور حکومت میں یہ تینوں سخت تکلیفوں میں رہے۔

میں نے ''جسارت'' میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی حکومت اور پالیسیوں کے خلاف سخت لکھا، اور مسلسل لکھا۔ ''ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے عروج وزوال کی کہانی'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی، جو بہت مقبول ہوئی، لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ اس معاملے میں توازن اور اعتدال کا دامن اگر تھامے رکھتا تو اچھا تھا۔ بھٹو صاحب کی شخصیت میں کچھ اوصاف ایسے تھے جنہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

انہوں نے لاہور میں عالم اسلام کے اس وقت کے سربراہوں کی کانفرنس بلائی،

شاہ فیصل کے تعاون سے پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کا کارنامہ سرانجام دیا، حالانکہ امریکہ نے اسی وقت انہیں دھمکی دی تھی کہ وہ ایسی جسارت نہ کرے، ورنہ اسے موت کا منہ دیکھنا پڑیگا، لیکن بھٹو صاحب نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کو محض ان کے خط لکھنے پر باہر سے بلا کر اس کام پر لگادیا۔ قادیانیوں کو غیرمسلم قرار دینے میں بھٹو صاحب نے اہم کردار ادا کیا۔ جمعے کے دن عام تعطیل بھی بھٹو صاحب کے دور حکومت میں ہوئی۔

عبدالکریم عابد صاحب کا کہنا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں امریکہ بھٹو صاحب کے ان کاموں کی وجہ سے انہیں ختم نہ کروا دے، اس لئے میری یہ کوشش رہی کہ جماعت اسلامی (جو اپنی تنظیمی قوت کی وجہ سے اس وقت حزب اختلاف کی سب سے بڑی پارٹی تھی) بھٹو صاحب کے خلاف تحریک میں شامل نہ ہو، کیونکہ اسکا نتیجہ مارشل لاء کی صورت میں ہی ظاہر ہوسکتا تھا، اس طرح بھٹو صاحب کا تو جو حشر ہوگا، وہ ہوگا ہی، ملک کی سالمیت کو اس کا بڑا نقصان ہوگا۔

اس وقت بھٹو صاحب کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے میرے مضامین میں بھٹو دشمنی کا رنگ غالب رہا، بعد میں احساس ہوا کہ ایک اچھے لکھنے والے کو ہر اہم معاملہ میں سارے پہلوؤں کو سامنے رکھکر، تجزیہ کرنا چاہئے اور اعتدال وتوازن کو قائم رکھنا چاہئے۔

سوال: حیدرآباد میں رہتے ہوئے، سندھ کے بڑے محقق ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صاحب کے ساتھ آپکی ملاقاتیں تو ضرور ہوئی ہونگی، ان کو آپ نے کیسا پایا؟

جواب: ڈاکٹر بلوچ صاحب سندھ کی تاریخ، سندھی زبان، لوک ادب اور

لطیفیات کے سندھ کے سب سے بڑے ماہر تھے، ان کا ادبی اور تحقیقی کام ایسا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، ہر ملاقات میں ڈاکٹر صاحب مجھے کہتے تھے، موسیٰ صاحب! آپ جس محاذ پر کام کر رہے ہیں، وہ سب سے بڑا محاذ ہے، آپ بہت بڑا جہاد کررہے ہیں، محمد ابراہیم جویو صاحب، جی ایم سید اور صوبھو گیان چندانی نے پوری زندگی کام کرکے ہماری ذہین نسلوں کو اپنے تاریخی اور تہذیبی ورثے سے بالکل دور کردیا ہے، آپ ان کی فکر کی رد میں اور اسلام (کی اصل روح سے آشنائی) کیلئے جس انداز میں کام کررہے ہیں، میرے دل میں اس کام کی بہت قدر ہے۔

کبھی، کبھی ڈاکٹر صاحب فون کرکے کہتے تھے کہ، بیداری رسالے کیلئے آپکی امانت میرے پاس پڑی ہوئی ہے، کوئی آدمی بھیج کر اپنی امانت منگوالیں۔ وہ امانت، بیداری کیلئے چندے کی رقم ہوتی تھی، جو کبھی ایک ہزار تو کبھی دو، چار ہزار روپے ہوتے تھے۔

بظاہر محسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب محض محقق، ادیب اور تعلیمی ماہر ہیں، فکری اور نظریاتی طور پر سندھ میں جو کشمکش جاری ہے، اس میں وہ غیر جانبدار ہیں، لیکن میری ڈاکٹر صاحب سے جب بھی ملاقات ہوئی، میں نے ڈاکٹر صاحب میں حمیت دین محسوس کی، اس سلسلے میں زیادہ تفصیل میں نے ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے موقعے پر بیداری سندھی میں لکھے ہوئے اپنے تفصیلی مضمون میں پیش کی ہے۔

سوال: آپ نے جی ایم سید کی شخصیت اور فکر پر بہت کچھ لکھا ہے ''پرین جی پچار'' اور جیکی ڈٹھو آہ مون'' کتاب میں ان کی شخصیت پر ۸۰ صفحات کا تجزیہ

بھی کیا ہے، کیا آپ کی جی ایم سید صاحب سے ملاقاتیں بھی ہوئیں؟

جواب: جی ایم سید صاحب سے میری ۳ ملاقاتیں ہوئیں، پہلی ملاقات ۱۹۷۱ع میں ان کی سالگرہ کے موقعے پر ہوئی، اس سالگرہ میں سندھ بھر سے ان کے معتقدین کی بڑی تعداد آئی ہوئی تھی، اس جلسے میں تقاریر بھی ہوئیں، جن میں بنگلہ دیش کے بعد سندھو دیش کے قیام کیلئے بڑی توقعات وابستہ کی گئیں اور بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کیا گیا ، میں نے سالگرہ والے جلسے کی رپورٹ روز نامہ ''جسارت'' میں مضمون کی صورت میں لکھی، دوسری ملاقات غالباً ۱۹۸۰ع میں ''سن'' میں ہوئی، مشہور ادیب نیاز ہمایونی صاحب سے تعارفی خط لیکر گیا تھا، موصوف انتہائی بہتر طریقے سے ملے، فرزند سے، جو تھوڑی دیر بعد آئے، میرا تعارف کراتے ہوئی کہا کہ یہ میاں محمد موسیٰ بھٹو صاحب ہیں، جو مسلسل میرے خلاف لکھتے رہتے ہیں'' اس ملاقات میں ان کی شخصیت کے مثبت پہلو کے ساتھ، اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیوں کا سخت موقف سامنے آیا۔

تیسری ملاقات ۱۹۸۴ع کی شروعات میں ہوئی، میں نے ففٹی موٹر سائیکل نئی لی تھی، اس پر'' سن'' گیا، میں اس وقت مولانا خیر محمد نظامانی صاحب کے اخبارات کے منتخب ادارتی نوٹ جمع کر رہا تھا، مولانا موصوف، جی ایم سید کے اخبار'' قربانی '' میں ایڈیٹر رہ چکے تھے۔خیال تھا کہ ''قربانی '' اخبار کے فائل محترم جی ایم سید صاحب کے پاس ضرور ہونگے، موصوف نے بتایا کہ میری لائبریری کی فائلیں اوپر نیچے ہوگئی ہیں، ایسے فرد کی تلاش ہے، جو کتابوں کو موضوع کے حساب سے سیٹ کرکے دے، فی الحال لائبریری دکھانے کے قابل نہیں ہے۔

'' سن'' جاتے ہوئے میری موٹر سائیکل'' مانجھند'' میں پنچر ہوگئی، اتفاقاً ''ناز

سنائی'' صاحب (جو مشہور قوم پرست ادیب ہیں) ہوٹل پر بیٹھے ہوئے تھے، اس نے احسان کیا اور پنکچر ٹھیک کروا کے دیا۔

سوال: آپ'' جسارت'' میں قوم پرستی کی تحریک کے خلاف برسوں سے لکھتے رہے تھے، جی ایم سید صاحب کا ان مضامین کے متعلق کیا ردعمل تھا ؟

جواب: ان کہنا تھا کہ، میں زندگی میں اتنے واقعات اور حادثات سے گذرا ہوں کہ اب میرے لئے تعریف اور تنقید دونوں برابر ہے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں،انہی دنوں میری نئی کتاب ''جدید سندھ کے مسائل اور ان کا حل'' کے نام سے شایع ہوئی تھی، اتفاقاً مولوی ارباب نیک محمد صاحب، جی ایم سید صاحب سے ملاقات کیلئے'' سن'' جارہے تھے، میں نے انہیں تعارفی خط بھی لکھ کر دیا ارو یہ کتاب بھی انکو تحفے کے طور پر بھیجی،محترم جی ایم سید صاحب نے نیک محمد صاحب کے ذریعہ خط کے جواب میں لکھا کہ،'' میں نے آپ کی کتاب مارکیٹ سے منگوا کر پہلے ہی پڑھ لی ہے، آپ نے یہ کتاب لکھ کر سندھ کی بڑی خدمت کی ہے۔

بعدمیں ان کے مختلف کارکنوں نے بتایا کہ سائیں نے تاکید کی ہے کہ'' محمد موسیٰ بھٹو صاحب کی یہ کتاب ضرور پڑھیں''۔

سوال: آپ کا ادارہ سندھ نیشنل اکیڈمی کب قام ہوا؟

جواب : ۱۹۸۲ع کے آخر یا ۱۹۸۳ع کے شروع میں۔

سوال: آپ کے ساتھ کون سے ساتھی شامل تھے ؟

جواب: مولوی محمد سلیمان طاہر صاحب، انور جوکھیو صاحب اور شکیل احمد خان صاحب، اس ادارے کے اوائلی میمبر تھے، چند ماہ کے بعدمحسوس ہوا کہ ہر دوست

اپنے کاموں میں مصروف ہے، کسی کیلئے وقت نکالنا مشکل ہے، البتہ انور جوکھیو صاحب نے ہمت کرکے ''پریں جی پچار'' کتاب کا ترجمہ کرکے دیا، اس کے بعد ادارے کے لئے دوسرے دوستوں کی تلاش شروع ہوئی، پروفیسر عبداللہ تنیو صاحب اور پروفیسر عبدالخالق سہریانی صاحب کے ساتھ خط و کتابت ہوئی، ان سے پہلے بھی رابطہ تھا، ان کی دعوت پر میں کندھ کوٹ جیکب آباد گیا، وہاں نئے ادارے کے قیام کی تجویز سامنے آئی اور طے ہوا کہ پروفیسر عبدالخالق سہریانی صاحب اس ادارے کا پورا خاکہ اور مقاصد وغیرہ تیار کرینگے، اس وقت یہ دونوں دوست گورنمینٹ کالج کندھ کوٹ میں پروفیسر تھے، عبداللہ پرنسپل تھے، دوسری میٹنگ عبداللہ صاحب کے گاؤں بیر شریف میں ہوئی (ضلع قمبر علی خان) وہاں عہدیدار وغیرہ منتخب ہوئے، پھر تیسری میٹنگ ایک ماہ کے بعد لاڑکانہ میں ہوئی، اس میں طے ہوا کہ یہ دونوں دوست جلد ہی حیدرآباد آئینگے اور ادارے کو مستحکم کرنے کیلئے کاوشیں شروع کرینگے، دو تین ماہ گذرنے کے باوجود یہ دوست حیدرآباد نہیں آسکے، میں نے عبداللہ تنیو صاحب کو خط لکھا، موصوف نے تفصیلی جواب دیا کہ میں اپنے وسیع تجربات کی بناء پر آپ کو یہ مشورہ دونگا کہ آپ ہم پر اعتماد نہ کریں، آپ خود متحرک بھی ہیں اور فکر مند بھی، آپ اپنی ذات کو ادارہ سمجھ کر کام شروع کر دیں، میری اور پروفیسر عبدالخالق صاحب کی نئے ادارے کی صدارت اور سیکرٹری شپ برائے نام ہے، آپ دوسرے دوستوں کی تلاش میں وقت ضایع نہ کریں، پہلے ہی بہت وقت ضایع ہو چکا ہے، محمد بن قاسم ادبی سوسائٹی کے ختم ہوجانے کے بعد بعد علمی ادارے کی بہت سخت ضرورت ہے، آپ کو ایک صحافی کی حیثیت سے کام کرنے کا وسیع تجربہ بھی حاصل ہے، آپ کا مطالعہ بھی اچھا ہے، ملک کے علمی طبقے

سے بھی آپ متعارف ہیں، آپ کام شروع کرینگے تو آپ کے ساتھ تعاون کرنے والے افراد ملنا شروع ہوں گے۔

پروفیسر عبداللہ صاحب کے اس خط سے میں ذہنی طور پر یکسو ہوگیا کہ ادارے کا زیادہ تر کام تو مجھے خود ہی کرنا ہے، دوسروں پر انحصار کیلئے وقت ضایع کرنے کا کیا فائدہ؟ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس سے پہلے میرا اور دوسرے ساتھیوں کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ پانچ، سات باصلاحیت افراد کے بغیر ادارہ نہیں چل سکتا، لیکن بعد میں معلوم ہو کہ اس قسم کا ادارہ، جس میں پانچ سات باصلاحیت اور متحرک افراد ہوں، اول تو ایسا ادارہ قائم ہونا مشکل ہے، اگر قائم ہو بھی گیا تو وہ ادارہ جلد ہی باصلاحیت اور ذہین افراد کی ایک دوسرے کی مخالف آراء اور مشوروں کی نذر ہوجائیگا اس طرح یہ ادارہ انتشار کا شکار ہوجائیگا، کسی بھی ادارے کو چلانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کوئی بھی باصلاحیت فرد خود کو ادارے کے لئے وقف کرکے، اللہ پر توکل رکھ کر اخلاص، استقامت اور بہتر حکمت عملی سے کام شروع کر دے تو اللہ تعالیٰ اسے تعاون کرنے والے افراد عطا کرتا ہے، جب ادارہ چل پڑے تو اس کے بعد ادارے میں دو، چار ایسے میمبر رکھے جائیں، جو ادارے پر پر ہر صورت میں اپنی رائے کو مسلط کرنے کی کوشش نہ کریں۔

الحمدللہ، میں نے اس بنیادی نکتے کو سمجھنے کے بعد کام شروع کردیا، اور اس کے اچھے نتائج نکلنے لگے، لیکن اس نکتے کو سمجھنے کیلئے خود کو ایک اللہ والے کے حوالے کرنا پڑا، اس سے باطنی بصیرت ملنا شروع ہوئی اور کام کرنے کیلئے ہمت اور حوصلہ بھی پیدا ہوا۔

پندرہ، بیس سالوں تک کتابوں کے مسودوں اور تراجم پر نظر ثانی کرنے اور خطوط کے جواب دینے اور کتابوں کی پروف ریڈنگ اور کتابیں لکھنے میں اس طرح خرچ کئے کہ، نہ دن دیکھا، نہ رات ، اس محنت کے نتیجے میں الحمد اللہ کام اچھا ہوا اور سندھی زبان میں سو سے زیادہ کتابیں شایع ہو کر علمی حلقوں تک اعزازی طور پر پہنچنے لگیں، لیکن اسکا صحت پر خراب اثر پڑا۔

ایک کمیونسٹ دانشور نے ہماری کتابوں کو پڑھنے کے بعد، اس زمانے میں یہ تاثر ظاہر کیا کہ سندھی زبان میں پہلی بار ہمارے فکر کا صحیح علمی، فکری اور استدلالی تعاقب شروع ہوا ہے، لیکن اب ہمارا فکری کام اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ اس قسم کا لٹریچر ہماری فکر کو روک نہیں سکتا، لیکن جلد ہی سوویت یونین زوال کا شکار ہوا، اور ساری دنیا کے ساتھ سندھ میں بھی کمیونسٹ تحریک کو بڑا نقصان ہوا، کئی کمیونسٹ سندھی دانشور تصوف کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

طویل عرصے تک صحافت سے وابستہ رہنے اور عالم اسلام کے اسلامی مفکرین اور فاضلوں کی کتابوں کے وسیع مطالعے کی وجہ سے جدید نظریات کی الجھنوں کو سمجھنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کا حصول، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے، جس کا میں جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے، چونکہ میں نے زندگی میں لکھنے اور پڑھنے کی علاوہ کوئی کام نہیں کیا، یہ اللہ کا اصول ہے کہ فرد جس کام میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کرتا ہے، اس کام میں اسے مہارت حاصل ہوتی ہے۔

اگرچہ لکھنے پڑھنے اور اس اشاعتی کام میں مالی فائدہ نہیں ہے، لیکن فرد اگر اسلام کی خدمت کی خاطر خود کو اس کام کیلئے وقف کرتا ہے، تو اللہ کی طرف سے اس

کے لئے مدد کی صورتیں نکلتی رہتی ہیں۔

سوال: آپ سندھی ''بیداری'' کے ذریعے اسلامی اعتبار سے ذہن سازی کا جو کام کررہے ہیں، وہ انتہائی اہم کام ہے، اس کے بارے میں آپ کچھ بتائینگے ؟

جواب: سندھی زبان میں ایک ایسے علمی اور نظریاتی رسالے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی، جس کے ذریعے سیکیولر دانشوروں کی طرف سے پیدا کئے ہوئے اعتراضات کا جواب دیا جا سکے، اور اسلام اور ملت اسلامیہ کے تصور کے بارے میں پیدا کی ہوئی الجھنوں کے حوالے سے ذہنوں کی صفائی کی جا سکے۔

الحمداللہ، اللہ تعالیٰ نے مؤثر طور پر بیداری سندھی سے یہ کام لیا ''بیداری'' ۲۶ سالوں سے مسلسل یہ کام کر رہا ہے، اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ آخر تک اس کام کو جاری رکھینگے اور اس سلسلے میں اپنی طرف سے خاص مدد کی صورت پیدا فرمائینگے، جس طرح اب تک مدد فرماتے رہے ہیں۔

سوال: آپ کے ادارے کی سات، آٹھ اہم کتابیں ''تنظیم فکر ونظر'' کی طرف سے شایع ہوئیں ہیں، اس بارے میں کچھ بتائیں۔

جواب: چند سال پہلے تنظیم فکر ونظر کے ذمیداروں نے فیصلہ کیا کہ ہماری طرف سے علمی اور فکری میدان میں کچھ نہ کچھ کام ہونا چاہئے، اس مقصد کیلئے انھوں نے مجھے دعوت دی کہ آپ سکھر آئیں اور ہماری مرکزی تنظیم کے میمبران سے ملیں، مرکزی باڈی سے تبادلہ خیال کریں اور سندھ کے موجودہ حالات میں علمی کام کرنے کیلئے صحیح نقوش اور خطوط پر مشتمل مقالہ بھی لکھ کر ساتھ لائیں، جو مرکزی باڈی کی مجلس میں پڑھ کر سنائیں، میں نے ان کی دعوت قبول کی اور مقالہ بھی لکھا اور پڑھا، طے ہوا کہ آپ

نے جس قسم کے فکری اور نظریاتی لٹریچر کی اشاعت پر زور دیا ہے، ہم خود اس کام کے قائل ہیں، بلکہ تنظیم کے قیام کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ سندھ کی جدید نسلوں کے سامنے مغربی تہذیب اور جدیدیت کے پس منظر میں اسلامی فکر پیش کی جائے، ہمارے ہاں اس قسم کے علمی مزاج کا کوئی فرد موجود نہیں ہے، اس لئے ہماری طرف سے یہ کام آپ ہی شروع کریں، میں نے ان سے عرض کی کہ اگر آپ مستقل مزاجی سے یہ کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں آخری حد تک آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں، لیکن چند مہینوں میں ہی محسوس ہوا کہ وہ اس کام میں سنجیدہ نہیں ہیں، انہوں نے مجھے کچھ وسائل دیئے، میں نے آٹھ کتابیں، ۵،۵سو کی تعداد میں شایع کردیں، اس کے بعد دوستوں سے گویا وہ بات ہی فراموش ہوگئی۔

اگر تنظیم اپنے وعدے پر قائم رہتی تو چند سالوں میں سندھی زبان میں کافی علمی اور نظریاتی لٹریچر کی اشاعت اور اس کے پھیلاؤ اور نئی نسل تک اس کے پہنچنے کی صورت پیدا ہو جاتی، تاہم بہر حال سات آٹھ اہم علمی کتابوں کی اشاعت کی صورت کا پیدا ہونا بھی سعادت سے خالی نہیں، اس کے لئے بھی میں تنظیم کے ذمیداروں کا شکر گذار اور ان کے لیے دعا گو ہوں۔

سوال: سندھ کے مسائل پر آپ کی لکھی ہوئی کتاب ''جدید سندھ کے مسائل اور ان کا حل'' ایک اہم کتاب ہے، لیکن اس کتاب میں ایک اعتبار سے قومیت کی تحریک کو مدد ملتی ہے، اس کتاب کو لکھتے وقت، آپ کے پیش نظر کیا مقصد تھا؟

جواب: میں ۱۹۸۳ع میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اخبار میں مضمون نگاری کا کام بطور سروس کے چھوڑ کر، سندھی زبان میں خالص علمی، فکری اور نظریاتی کام کروں گا، لیکن

''جسارت'' میں میرے مضامین کے ذریعے، میرے بارے میں سندھ کے علمی حلقے میں یہ تاثر پیدا ہو چکا تھا کہ موسیٰ صاحب سندھ اور سندھ کے مسائل اور سندھ کی قومی تحریک کے سخت مخالف ہیں۔

اس کے علاوہ اس وقت ''ایم آر ڈی'' تحریک نے سندھ میں قومی حقوق کے بارے میں بڑا شعور بیدار کیا تھا اور پنجاب اور مرکزی حکومت کے خلاف سندھ میں سخت نفرت پھیل چکی تھی، ہندوستان کی اس وقت کی وزیر اعظم'' اندرا گاندھی'' نے بیان دیا تھا کہ'' ہم سندھ کی قومی تحریک کو پاکستان میں تنہا نہیں چھوڑینگے، بنگلہ دیش کی طرح سندھ والوں کی بھی مدد کرینگے۔

اس صورت حال میں میں نے ضرورت محسوس کی کہ سندھ میں میری طرف سے ہونے والے علمی اور نظریاتی کام کیلئے سندھ کے علمی طبقے میں میرے بارے میں فضا ہموار ہو، اس کے علاوہ یہ خیال بھی تھا کہ سندھ سے ہونے والی ناانصافیوں میں اہل پنجاب کا جو ہے، اسے اسی حد تک پیش کیا جائے، ساتھ ساتھ اپنی کمزوریوں کا اسمیں جو حصہ ہے، اس کی بھی نشاندھی کی جائی، اور سندھ کے وڈیروں پر مشتمل قیادت کے کردار کو بھی سامنے لایا جائے، اس سلسلے میں میں نے تقریباً پچاس سالوں کے اہم سندھی اخبارات کی فائلوں کا مطالعہ کیا اور چار سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اخبارات کے اس رکارڈ سے تفصیلی حوالے دیئے۔

اسی کتاب کو تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اردو میں بھی ''پاکستان میں قومیتوں کے مسائل اور ان کا حل'' کے نام سے شایع کیا، اس کتاب کے کئی اہم مضامین'' جسارت '' کے اس وقت کے ایڈیٹر عبدالکریم عابد صاحب نے ''جسارت'' میں بھی شایع کئے ۔

سندھی میں اس کتاب کے چھپنے سے میرے اپنے دوستوں کے حلقے میں کافی ناراضگی پیدا ہوئی، قربان علی بگٹی صاحب اور پروفیسر عبداللہ تنیو جیسے بزرگ دوستوں نے سخت ردّعمل ظاہر کیا، لیکن سندھ کے مسائل پر واضع موقف اختیار کرنے کی وجہ سے یہ فائدہ ہوا کہ سندھ کے علمی حلقوں میں میرے بارے میں کسی حد وہ غلط فہمی دور ہوئی کہ یہ سندھ کے دشمنوں کا آلۂ کار ہے۔

اس کتاب کے بعد ہماری جو نظریاتی کتابیں شایع ہوئی، الحمد اللہ، ان سے کمیونسٹ فکر اور قوم پرستی کی تحریک کو دھچکا لگا، بعد میں قربان علی بگٹی اور عبداللہ تنیو صاحب نے بھی میری اس حکمت عملی کو بہتر قرار دیا۔

سوال: شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام پر کیا ہوا آپ کا کام کس مرحلے میں ہے؟

جواب: شاہ صاحب کے کلام کے ابتدائی ۹ سروں کی تشریح دس بارہ سال پہلے پہلی جلد کی صورت میں شایع ہو چکی ہے، اس کے علاوہ پورے رسالے کی منتخب شاعری پر مشتمل دو کتابیں ''شاہ عبداللطیف بھٹائی کا پیغام جدید انسان کے نام'' اور'' عرفان لطیف'' کے نام سے شایع ہو چکی ہیں، مزید کام درمیاں میں رہ گیا ہے۔

سوال: کیا اسکا سبب آپ کی سستی ہے یا مصروفیت ؟

جواب: سستی، غفلت اور مصروفیت، دونوں کا عمل دخل ہے، شاہ کے رسالے پر جو تازہ کام ہوا ہے، وہ محترم ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب کا ہے، موصوف نے شاہ کے کلام کی مکمل تشریح کا کارنامہ سرانجام دیا ہے، جو کلام کے متن کے ساتھ تقریباً ۱۲سو صفحات پر مشتمل سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے شایع ہوا ہے، شاہ کے رسالے پر یہ

پہلا مکمل کام ہے، جو سامنے آیا ہے، نئی نسلوں کی لئے اس کام کی اہمیت اس لئے بھی ہے، کہ اس تشریح میں موصوف نے شاہ صاحب کی زبان کو جدید اسلوب کی شکل دی ہے، تشریح کے ساتھ مفہوم بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، شاہ صاحب کے ابیات میں پیش کردہ مفہوم کی تائید میں جگہ جگہ موصوف نے مولانا رومی کے اشعار بھی دیئے ہیں، جس سے ان کی کی ہوئی تشریح کی اہمیت بڑھ گئی ہے، موصوف اس سے پہلے اس قسم کا کام شاہ عبدلکریم بلڑی والوں اور خواجہ محمد زمان لواری والوں کے کلام کی تشریح کی صورت کر چکے ہیں۔ محترم عبدالغفار سومرو صاحب عربی اور فارسی زبان سے بھی آشنا ہیں، اس لئے عربی اور فارسی شاعری سے براہ راست استفادہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب کے اس نوعیت کے علمی کام کو دیکھتے ہوئے انتہائی خوشی ہوتی ہے کہ سندھ میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کے بعد محترم ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب کی صورت میں دوسری اہم شخصیت موجود ہے، جو اپنے اکابر بزرگوں کے کلام اور ان کے کلام پر تشریح وتحقیق کرکے نئی نئی کتابیں ہمیں دیتی رہتی ہے۔

سوال: آپ کا شاہ کے رسالے پر مزید کام کرنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟

جواب: الحمداللہ، شاہ کے رسالے کا مفہوم میرے قلب پر نقش ہے، کیونکہ یہ کلام سلوک کے مراحل طے کرنے والے ہر سالک کے حالات و واردات کی کہانی اور عکاسی پر مشتمل ہے (یعنی شاہ صاحب نے سالک کے حالات و واردات کو شاعری کی صورت دی ہے) اس کے لئے بہت زیادہ محنت کی ضرورت نہیں پڑیگی، لیکن طویل عرصے تک لگاتار ان تھک محنت اور علمی کام کی وجہ سے اب ذھن تھک چکا ہے، اللہ کی ذات میں

امید ہے کہ وہ اتنی ذہنی توانائی اور ہمت عطا فرمائینگے کہ عشق کے فلسفے کے سب سے بڑے نمائندے شاہ عبداللطیفؒ کے پورے کلام کی روح کو پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوگی ۔

سوال: آپ کا ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے ادارہ مسلم انسٹیٹیوٹ لندن کے ''اسلامی، انقلابی فکر'' کے ساتھ بھی تعلق رہا، اس کے بارے میں کچھ بتائیں ؟

جواب: ''جسارت'' میں مسلسل مضامین لکھنے سے، پورے ملک کے علمی حلقے میں میرا کافی تعارف رہا ہے، (اس زمانے میں '' جسارت'' ملک کا سب سے زیادہ مؤثر اخبار سمجھا جاتا تھا، ملک کا سیاسی اور علمی حلقہ بھی '' جسارت'' کو زیادہ ترجیح دیتا تھا) جسارت میں اس زمانے میں میرے اسلامی انقلاب کے متعلق کچھ مضامین شایع ہوئے، یہ مضامین مسلم انسٹیٹیوٹ تک پہنچے، مسلم انسٹیٹیوٹ نے ۱۹۸۲ع سے لندن میں سالانہ سیمیناروں کا سلسلہ شروع کیا تھا، جس میں عالم اسلام کے عالموں اور دانشوروں کو مدعو کیا جاتا تھا، یہ چار یا پانچ دنوں کا پروگرام ہوتا تھا، ۱۹۸۳ع میں ڈاکٹر غیاث الدین صدیقی صاحب، جو ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے اس کام میں ساتھی تھے، وہ اس سلسلے میں پاکستان میں اسی خیال کے حامل اہل علم کو براہ راست سیمینار میں شرکت کی دعوت دینے کے لئے آئے تھے، انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا، اور مسلم انسٹیٹیوٹ کے اغراض اور مقاصد کی تفصیل بتائی، میں نے ان سے اتفاق کا اظہار کیا، موصوف نے کہا کہ آپ کے دوستوں میں اگر اس فکر کے دوسرے افراد بھی ہوں تو ان کے نام دیں اور ان سے ملوائیں، میں نے انہیں مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کا نام دیا اور مولانا کو اس کی اطلاع دی، موصوف حیدرآباد سے کراچی جا رہے تھے، وہ ڈاکٹر صاحب سے

ملے، ڈاکٹر صاحب نے انہیں بھی دعوت نامہ دیا اور سیمینار میں شرکت کیلئے زور کیا، اس طرح ہمارا ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے ادارے سے تعلق قائم ہوا، ۱۹۸۳ء میں انسٹیٹیوٹ کے سالانہ سیمینار میں شرکت کے لئے میرے ساتھ مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب، اور لاہور سے سید اسعد گیلانی صاحب اور کوئٹہ سے مشہور صحافی امان اللہ شادے زئی صاحب شامل تھے، سیمینار کے بعد ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب سے تفصیلی گفتگو بھی ہوئی، جس میں انہوں نے پاکستان میں اس فکر سے وابستہ افراد کو جمع کرنے اور علمی رسالہ شایع کرنے اور مرکز قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔

ان کا مزید کہنا تھا کہ، '' آپ اس معاملے پر مزید غور وفکر کریں، اب آپ سے مسلسل رابطہ رہے گا'' میں چونکہ خود کو سندھی زبان میں علمی، فکری اور، نظریاتی لٹریچر تیار کرنے اور اہل تصوف سے باقائدہ تعلق قائم کرنے کا ارادہ کر چکا تھا، اس لئے سیمینار میں شرکت کے بعد میں عملی طور پر ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے ادارے سے لاتعلق ہو گیا، اس طرح یہ محاذ مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کے حوالے ہوا۔

ایک دو سالوں کے اندر مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کو انسٹیٹیوٹ کی طرف سے مرکز قائم کرکے دیا گیا اور پانچ، پانچ ہزار کی تعداد میں دو رسائل جاری کرنے کے وسائل بھی فراہم کئے گئے، پانچ، سات سالوں تک یہ کام چلتا رہا، لیکن کوئی خاص نتیجہ سامنے نہیں آیا، اور جلد ہی مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کو پس منظر میں جانا پڑا۔

اصل میں اہل اللہ سے تعلق مستحکم کئے بغیر، عام طور پر اللہ کے ساتھ تعلق مستحکم نہیں ہوتا، اللہ کے ساتھ تعلق مستحکم نہیں ہوتا تو باصلاحیت افراد دینی اداروں اور دینی جماعتوں کے لئے زیادہ مفید اور کارگر ثابت نہیں ہوتے، کیونکہ ہر معاملے میں انہیں اپنے

مفاد سامنے آ کر اس کام میں سخت رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔

مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کو میں اہل تصوف سے استفادہ کی تاکید کرتا رہا، میں نے انہیں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحبؒ سے روحانی تعلق قائم کرنے کا کہا، اور اس پر اصرار کیا، وہ ۱۹۵۴ع میں حضرت مولانا حماداللہ ھالیجوی سے بعیت بھی تھے، ان کے ملفوظات بھی مرتب کئے تھے، جو شایع ہوئے، اس لئے وہ تصوف کی حلاوتوں سے آشنا تھے، لیکن طویل عرصے تک بزرگوں کی صحبت سے دوری اور اسلامی نظام کی نصب العینی فکر سے وابستگی کی وجہ سے وہ تصوف سے دور ہوگئے تھے، میرے اصرار پر وہ حضرت ڈاکٹر صاحب سے بعیت تو ہوئے، لیکن عملی طور پر اس تعلق کو قائم نہ رکھ سکے، اس لئے جو دوست ان کے گرد جمع ہوئے تھے، وہ ان سے جدا ہوتے گئے اور انسٹیٹیوٹ کے مرکزی ذمیداروں کا بھی ان پر اعتماد باقی نہ رہا۔

سوال: آپ جماعت اسلامی صوبہ سندھ کے دفتر میں مولانا جان محمد عباسی کے ساتھ بھی کچھ عرصہ رہے ہیں، انکے بارے میں کچھ اہم باتیں ہوں تو بتائیں؟

جواب: میں ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۴ء تک لگ بھگ ۵سال جماعت اسلامی صوبہ سندھ کے دفتر میں رہا، جو پہلے تو لطیف آباد ۷نمبر میں تھا، بعد میں لطیف آباد ۳ نمبر میں منتقل ہو گیا تھا، مولانا جان محمد عباسی صاحب تقریباً ۲۸سال جماعت اسلامی صوبہ سندھ کے امیر بھی رہے، موصوف ذہین، سمجھدار متحرک اور فعال شخصیت تھے، سیاسی تجزیوں میں ہوشیار تھے، تقریر بھی اچھی کرتے تھے، وہ جماعت اسلامی کا سرمایہ تھے، میل میلاپ، تعلقات اور لوگوں کے کام کاج کے سلسلے میں بھی بہتر انسان تھے، عام طور پر ہر فرد سے جلد گھل مل جاتے تھے، ۱۹۷۳ء میں موصوف نے قائم مقام امیر

جماعت کل پاکستان کی حیثیت سے پورے کا دورہ کیا، اس دورے میں میں انکے ساتھ تھا، یہ انکی محبت تھی کہ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھا، ہم پندرہ دن جماعت اسلامی پاکستان کے مرکز (جو اس وقت اچھرے لاہور میں تھا) میں بھی رہے، مولانا مودودی کا گھر اور دفتر بھی وہیں تھا، مولانا مودودی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اس وقت میں ہفتہ روزہ رسالے ''لیل ونہار'' کا سندھ کا وقائع نگار خصوصی تھا، مجیب الرحمان شامی صاحب اس رسالے کے ایڈیٹر تھے ۔

مولانا عباسی صاحب کی شخصیت ہر اعتبار سے پرکشش تھی، البتہ انہیں کتابوں کے مطالعے سے کوئی شغف نہیں تھا، چنانچہ فکری طور پر جو بلندی اس قسم کی شخصیت میں موجود ہونی چاہئے، اس کی کمی تھی، فرد جس شخصیت سے چار پانچ سال تک ساتھ رہتا ہے، اس سے مختلف معاملات میں اختلاف رائے کا ہونا فطری بات ہے، ۱۹۷۴ع میں میں نے ''سندھ میں بے چینی کے اسباب'' کے نام سے کتاب لکھی، مولانا نے اس کتاب کو پسند نہیں کیا، بلکہ، جماعت کے امیر کی حیثیت سے موصوف نے کہا کہ ''آپ اس کتاب کو مارکیٹ میں نہ لائیں'' کیونکہ آپ کا تعارف جماعت اسلامی کے اہل قلم کی حیثیت سے ہے، ان کی رائے کے پیش نظر میں کتاب کو مارکیٹ میں نہیں لایا، ان کی اس بات کا میرے مزاج پر منفی اثر ہوا، حالانکہ امیر جماعت ہونے کی حیثیت سے یہ ان کے فرائض میں شامل تھا کہ جس چیز کو جماعت کیلئے نقصاندہ سمجھیں، اس کی روک تھام کریں، لیکن تزکیہ نہ ہونے کی وجہ سے میں ردعمل شکار ہو گیا، اس طرح میں نے ''جسارت'' میں سندھ کے حالات پر مضامین لکھنا شروع کئے، اور میرے مضامین کو ''جسارت'' کے اس وقت کے مدیر عبدالکریم عابد صاحب نے غیر

معمولی اہمیت کے ساتھ ہفتہ وار رنگین صفحات میں شایع کرنا شروع کردیا، اور میرے نام کے ساتھ ''وقائع نگار خصوصی برائے سندھ'' بھی لکھنا شروع کیا، جس سے محسوس ہوا کہ انہیں اس قسم کے وقائع نگار کی ضرورت ہے، اس وقت کے جماعت اسلامی صوبہ سندھ کے سیکرٹری صاحب نے کہا کہ آپ عباسی صاحب کو کہیں کہ وہ عابد صاحب کو فون کرکے کہیں کہ وہ آپ کا وقائع نگار خصوصی کی حیثیت سے باقائدہ تقرر کریں، میں نے انہیں کہا، لیکن مولانا موصوف نے معذرت کردی۔

اس قسم کے مختلف واقعات کی وجہ سے میرے نہ چاہتے ہوئے بھی میرے مزاج میں تلخی پیدا ہوئی، حالانکہ موصوف ایسا کرنے میں حق بجانب تھے، بعد میں جب میرا تعلق اہل تصوف سے ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ باطنی بیماری تھی، جس میں میں مبتلا تھا، باطنی بیماریوں کی حالت میں غلبۂ دین کا کام کرنا سخت نقصان کا باعث ہے۔

سوال: کیا آپ کو یہ احساس اور ادراک تصوف سے وابستگی کے بعد ہوا ؟

جواب: جی ہاں، اس سے پہلے، یعنی ۱۹۸۳ع تک اس قسم کے احساسات کا میں شکار ہوتا رہا، حالانکہ اس دور میں لگاتار میں مضامین بھی لکھتا رہا اور کتابوں کی اشاعت کے ذریعے دین کی خدمت کا کام بھی ہوتا رہا، لیکن اس کام میں سخت نفسی رکاوٹیں موجود رہیں، جس سے اندازہ ہوا کہ اہل تصوف سے کسی حد تک اپنا تزکیہ کرانے سے پہلے، فرد حالت خطرے میں رہتا ہے اور اہل تصوف اپنی تحریروں میں یہ نکتہ بڑی شدو مد سے بیان کرتے رہے ہیں۔

سوال: جن دانشوروں کا اوپر ذکر ہوا، ان کے حوالے سے اگر کچھ اہم باتیں اور واقعات ہوں تو بیان کریں، تاکہ نئی نسل ان کی باتوں سے کچھ سیکھ سکے ۔؟

جواب: مولانا جان محمد عباسی صاحب کے بارے میں کافی تفصیل بیان ہوچکی ، مزید یہ کہ، موصوف کے لاڑکانہ کی اہم سیاسی شخصیات مثلاً محمد ایوب کھڑو صاحب، قاضی فضل اللہ صاحب، نواب نبی بخش بھٹو صاحب کے ساتھ اچھے ذاتی تعلقات تھے، جماعت اسلامی میں شامل ہونے سے پہلے ہی یہ تعلقات تھے، جس سے ان کے سیاسی رجحان اور میلان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ذوالفقار علی بھٹوصاحب نے جب پیپلز پارٹی قائم کی تو مولانا جان محمد عباسی صاحب سے رابطہ کر کے، انہیں ساتھ دینے کا کہا، لیکن مولانا نے ان سے انکار کر دیا۔

موصوف ۱۹۵۵ع میں جماعت اسلامی کے رکن بنے اور جلد ہی خیرپور ڈویژن کے امیر بن گئے، (اس وقت تک سکھر اور لاڑکانہ ڈویزن نہیں بنے تھے) موصوف کے والد مولانا غلام رسول صاحب اس وقت کے کوئٹہ کے چشموی بزرگ کے مرید تھے اور اپنے علاقے کے بہت اچھے عالم تھے، ان کی کوشش تھی کہ ان کا فرزند درس و تدریس کا کام کرے اور پوری زندگی دینی علم کی خدمت میں گذارے، لیکن جب ایسا نہ ہوا تو وہ کافی متفکر ہو گئے، ان کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ مولوی کا کام مدرسہ اور مسجد سنبھالنا ہے، تا کہ لوگوں کو ان کے دینی علم میں سے کچھ فیض حاصل ہوسکے، ورنہ مولوی دین کا حق ادا نہیں کر سکے گا، موصوف کے فرزند بدرالدین عباسی اور لاڑکانہ کے اس وقت کے ایک عالم کا کہنا تھا کہ مولانا غلام رسول صاحب دین کے ایسے سیاسی تصور کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، جس میں سیاسی محاذ پر خدمت دین کا کام نصیب العینی کام ہو، اس سلسلے میں وہ عمر بھر اس پریشانی میں مبتلا رہے کہ وہ کسی طرح اپنے فرزند کو اس فکر سے ہٹا کر، درس وتدریس کے کام پر آمادہ کریں، لیکن میں سمجھتا ہوں کے مولانا جان محمد عباسی صاحب

نے جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے جو کام کیا تھا، وہ انتہائی اہم اور ہر لحاظ سے لائق تحسین کام ہے۔

سید علی میر شاہ صاحب، جو سندھ کے بڑے دانشوروں اور فاضلوں میں شمار ہوتے ہیں، تقریباً ۸۵ برس کی عمر میں وہ اب بہت کمزور ہو چکے ہیں، موصوف کا مطالعہ وسیع ہے، عربی، فارسی پر عبور رکھتے ہیں، ۳۰،۲۵ سالوں تک وہ مسلسل درس قرآن بھی دیتے رہے، کبھی اپنے بنگلے پر تو کبھی اپنے دوستوں کے گھر پر، درس قرآن کا یہ ماہانہ سلسلہ تھا، جو طویل عرصے تک جاری رہا، شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کے تو وہ حافظ ہیں، دینی علوم کے ساتھ جدید مغربی مفکروں کی کتابوں کا بھی وسیع مطالعہ کیا تھا، جو ہمارے حلقے میں قربان علی بگٹی صاحب کے علاوہ کسی کا نہیں تھا، شاہ صاحب زمیندار ہیں، اس کے ساتھ ''پیر'' بھی ہیں، انہیں مطالعے کا جنون رہا ہے، مختلف تنظیموں اور اداروں کے میمبر بھی رہے ہیں، برسوں تک سندھ آباد گار بورڈ کے صدر رہے، اس اعتبار سے کافی کام بھی کیا، محمد بن قاسم سندھی ادبی سوسائٹی کے بھی چند سال صدر رہ چکے ہیں، ''آباد گار رسالے میں صحابہ کرام کی شخصیات پر مضامین کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا، جو بعد میں کتابی صورت میں شایع ہوا، لیکن اگر وہ علمی اور فکری کام کے لئے وقت نکال سکتے تو ان کے کام سے سندھ کے علمی حلقے کو بہت فیض حاصل ہوتا، شاہ صاحب سے میری ملاقات، آج سے دس پندرہ سال پہلے ادارہ '' تعمیر ملت'' منصورہ کی میٹنگ کے دوران ہوئی، جو کافی تفصیلی ملاقات تھی، ان کی طبیعت کی کمزور حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ آپ شاہ عبداللطیف بھٹائی ؒ کے کلام کے حافظ ہیں، آپ سے کچھ عرض کرنا اگر چہ گستاخی ہے، لیکن اس کے بغیر رہا بھی نہیں

جاتا کہ اب آپ عمر کے جس مرحلے میں ہیں، اس میں آپ کو دوسری ساری مصروفیات کو کم کرکے، اللہ اللہ کرنا چاہیے، اسم ذات کے قلبی ذکر سے آپ کو نئی روحانی، ذہنی اور وجدانی توانائی حاصل ہوگی، اس موضوع پر میں انہیں تقریباً آدھے گھنٹہ گذارش کرتا رہا۔

آکر پڑھ الف جو پیا سپ ورق وسار

اندر کي اجار پنان پڑھندين ڪيترا

شاہ صاحب میری یہ ساری گفتگو خاموشی سے سنتے رہے، آخر میں کہا کہ آپ کی گفتگو سے مجھے روحانی طور پر فائدہ ہوا ہے، لیکن اب مراقبے کی طرف ذہن اور دل کو آمادہ کرنا مشکل ہے۔

پروفیسر کریم بخش نظامانی صاحب کے والد، نقشبندی سلسلے کے کسی بزرگ کے خلیفہ تھے، لیکن کالج کی تعلیم کے دوران ہی موصوف کمیونسٹ فکر سے متاثر ہوئے، اس لئے کچھ عرصے تک دین و مذہب کے بنیادی عقائد سے دور ہو گئے، بعد میں کسی شناسا نے انہیں مولانا مودودی کی کچھ کتابیں دیں، ان کتابوں کے مطالعے سے ان پر اسلامی فکر کی اہمیت اجاگر ہوئی اور وہ توبہ تائب ہوئے اور آخر وقت تک جماعت اسلامی سے ان کا تعلق قائم رہا، موصوف نے کافی کتابیں لکھیں، دو تین کتابوں کے علاوہ، ان کی ساری کتابیں دینی اور مذہبی نوعیت کی ہیں، لیکن جدید فکر کا تعاقب کرنے کیلئے وہ کوئی خاص علمی کام نہ کرسکے۔

موصوف تقریر بہت عمدہ کرتے تھے، ان کی تقریر معلومات سے بھری ہوئی اور خطیبانہ قسم کی ہوتی تھی، جس سے عام افراد کے ساتھ علمی حلقہ بھی متاثر ہوتا تھا، یہ بھی

اٹل حقیقت ہے کہ جتنا بڑا دانشور ہوگا، وہ اگر کسی اہل اللہ کی صحبت اختیار نہیں کرے گا تو وہ سخت ذہنی دباؤ سے نہیں بچ سکے گا، موصوف بھی کئی برسوں تک ذہنی دباؤ کا شکار رہے، کافی عرصہ گھر میں رہے، باہر نہیں نکلتے تھے، اسی دوران انہوں نے اللہ تعالیٰ سے رو کر دعا مانگی کہ ''مجھے صحت عطا فرما، تاکہ میں علمی طور پر دین کی خدمت کر سکوں۔ ''اللہ تعالیٰ نے انہیں صحت عطا فرمائی، اس کے بعد انہوں نے، ''معارف حدیث'' کے نام سے مشہور اردو کتاب (جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے) کا سندھی میں ترجمہ کیا، پھر انہوں نے خود بھی کئی کتابیں لکھیں، سیرت پاک پر نبوت کے جھوٹے دعویدار، اور اقبال اور بھٹائی کے نام سے بھی کتابیں لکھیں، عمر کے آخری تیں سالوں میں مجھے پتہ چلا کہ انہیں دل کا عارضہ لاحق ہوگیا ہے، میں ان کی عیادت کے لئے ان کے گھر گیا، مجھے انہوں نے کافی وقت دیا، میں نے انہیں اپنے تجربے کی بنا پر مشورہ دیا کہ آپ کو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب جیسے بزرگ کی صحبت کی اشد ضرورت ہے (اس وقت ڈاکٹر صاحب حیات تھے) اس سے آپ کو نئی روحانی توانائی ملے گی اور آپ احساسات کی دنیا سے بلند ہوجائینگے، انہوں نے کہا کہ میں نے تصوف کی کتابیں نہیں پڑھیں، اگر آپ کے پاس تصوف پر اہم کتابیں موجود ہوں تو مجھے دیں، میں دوسرے ہی دن ان کو چند اہم کتابیں دے آیا، لیکن اس کے بعد ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

قربان علی بگٹی صاحب ہمارے حلقے کے بہت بڑے دانشور تھے، جنہوں نے سندھ کے کمیونسٹ اور قوم پرست بڑے دانشوروں کی کتابوں پر تنقیدی مضامین لکھ کر، ان کی فکر اور علمی کمزوریوں کو بے نقاب کیا، یہ کام انہوں نے مغربی مفکروں اور دانشوروں کی فکر کے پس منظر میں کیا۔

بگٹی صاحب سے میرے گہرے تعلقات تھے، میں سال میں دوچار بار گاؤں جاتا تھا، لاڑکانہ میں ایک دو دن ان کے ساتھ گذارتا تھا، ان کی صحبت سے میرے علمی ذوق میں اضافہ ہوا، مجھے ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی کتابوں کے مطالعے کا ذوق ان کے گفتگو سے ہوا، بگٹی صاحب بیراج مختیارکار کے آفس میں کلرک تھے، پھر ہیڈ منشی بنے، آخر میں اسسٹنٹ مختیار کار ہوئے، آمدنی بہت کم تھی، کیونکہ بہت ایماندار تھے، ان کے پاس منتخب کتابوں کی اچھی لائبریری تھی، حافظہ بہت تیز تھا، موصوف کے ساتھ ان کے مخلص ساتھی مالی تعاون کرتے تھے، دکھ کی بات ہے کہ سندھ میں اتنے بڑے دانشور کی موجودگی کے باوجود ہم اس کے علم سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے، ان کے ذہن کے کمپیوٹر میں اسلامی تاریخ، مغربی تاریخ، اسلامی مفکر، اور مغربی مفکر، شاہ بھٹائی، علامہ اقبال وغیرہ سارے موجود تھے، لیکن ایسے دانشور کو وسائل دیکر علمی کام کیلئے فارغ کرنے کی توفیق ہم میں کسی کو حاصل نہ ہوسکی، وہ نوے فیصد علم اپنے ساتھ لے گئے، ۴۷ برس کی عمر میں ۱۹۸۶ء میں دل کے عارضے میں مبتلا ہوکر فوت ہو گئے۔

ہم نے ۱۹۸۵ء کے شروع میں ''علم جدید کا چیلنج'' ''مذہب اور سائنس'' اور تلاش حق جیسی کتابیں شایع کیں تو بہت خوش ہوئے، کہا کہ سندھ کے علمی حلقے کو اس قسم کی کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔

میاں محمد شوکت صاحب، جو کافی عرصے تک جماعت اسلامی حیدرآباد کے امیر بھی رہے، اور جماعت کے سندھ صوبے کے سیکریٹری بھی رہے، وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، انتہائی وسیع مطالعہ تھا، علامہ اقبال کے کلام کو سمجھنے کیلئے انہوں نے فارسی زبان سیکھی، خدمت خلق کے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، وہ لوگوں سے ملاقات

کے لئے ہر وقت دستیاب ہوتے تھے، رات گئے بھی اگر کوئی ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا تھا تو وہ باہر نکل آتے تھے۔

تصوف پر بھی ان کا اچھا مطالعہ تھا، ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بہت خوش اخلاق اور ملنسار تھے، اپنی ذات کو فنا کر چکے تھے، ضرورت سے زیادہ گفتگو سے پرہیز کرتے تھے، مشکل وقت میں ہر ایک کی مدد کرتے تھے، جماعت اسلامی سے باہر ہونے والے دینی، علمی اور دعوتی کام کے بھی قدر دان تھے۔

میں نے جب خود کو سندھی زبان میں علمی کام کیلئے وقف کیا اور چند سالوں میں کافی کتابیں شایع کیں، تو انھوں نے کہا کہ، ''یہ آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے کہ آپ نے سندھی زبان میں اتنا بڑا نظریاتی لٹریچر تیار کیا ہے، یہ بھی کہا کہ آپ اپنوں اور غیروں کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر، اپنا کام کرتے رہیں، کام کرنے والے کام کرتے رہتے ہیں، جب کہ باتیں کرنے والے باتیں ہی کرتے رہ جاتے ہے۔

مولانا جان محمد بھٹو صاحب جن کا اوپر تھوڑا ذکر ہوا ہے، وہ خالص دعوتی اور تربیتی مزاج کے فرد تھے، جماعت اسلامی میں اس طرح کا دوسرا اہل اللہ، شاید ہی کوئی ہو، تہجد گذار، مراقبہ کرنے والے، کم گو، بہترین اخلاق کے حامل، سیاست میں وقت ضایع کرنے سے محفوظ شخصیت، ''جامعہ اسلامیہ منصورہ'' اور جامعہ ریاض العلوم (ٹنڈو جام روڈ حیدرآباد) کے بانی مبانی۔

میں زندگی میں سیرت اور کردار کے اعتبار سے سب سے زیادہ مولانا جان محمد بھٹو صاحب سے متاثر ہوا، میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کے مولانا کے انتقال کے بعد میں نے ایسی شخصیت کی تلاش میں ہی تصوف کو اختیار کیا، اور الحمداللہ، مجھے

ایسی مثالی شخصیت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی صورت میں مل گئی، جنہوں نے اپنے خاص فیض نظر سے مجھے راہ سلوک پر چلایا۔

اس سارے سوال جواب میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحبؒ کا ذکر نہیں آسکا، ڈاکٹر صاحب سندھ یونیورسٹی میں اردو ڈپارٹمینٹ کے سربراہ تھے، سو سے زیادہ ادبی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف تھے، زھد، فقر اور درویشی میں اپنی مثال آپ تھے، صاحب کشف بھی تھے، لیکن انکی سب سے بڑی وصف ''فنائیت'' تھی، انہوں نے اپنے نفس کو اتنا فنا کیا تھا کہ اپنی معاشرت اور لباس میں سب سے زیادہ مفلس نظر آتے تھے، ملنسار اتنے کہ فرد محسوس کرتا تھا کہ گویا وہ میرے خاندان کے کوئی بزرگ ہیں، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت پر میں نے '' عصر حاضر کے غلام مصطفیٰ '' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں تفصیل سے ان کی زندگی کے حالات و واقعات بیان کئے ہیں۔

سوال: آپ کا ڈاکٹر اسرار احمد سے بھی تعلق رہا، کیا اس کی تفصیل بتائیں گے؟

جواب: ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بہترین مقرر تھے، ان کی تقریر دل پر اثر کرتی تھیں، یہ ان کے دل کی قوت تھی، یا قرآن سے گہرے تعلق کا نتیجہ تھا؟ اس کو قرآن کے ساتھ تعلق کا نتیجہ ہی کہا جا سکتا ہے، ۱۹۸۳ع میں تنظیم کے مقامی امیر قاضی عبدالقادر صاحب نے شہر کے ایک علاقے اسلام آباد میں ڈاکٹر صاحب کے لئے ایک جلسے کا اہتمام کیا تھا، اس میں شریک ہونے کا موقعہ ملا اور ڈاکٹر صاحب سے ملاقات بھی ہوئی، اس کے بعد قاضی عبدالقادر صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ماتلی اور بدین کا دورہ کرنا چاہتے ہیں، ان علاقوں میں اگر آپ کے تعلقات ہوں تو آپ ڈاکٹر صاحب کے دورے کا پروگرام رکھنے میں ہماری مدد کریں، میں نے

بدین میں مولانا غلام علی گوپانگ صاحب، جو بدین کے بڑے عالم، اور جامع مسجد کے خطیب بھی تھے، ان کے ذریعے بدین میں موصوف کا پروگرام رکھوایا اور ماتلی میں شوکت صاحب، جن سے دوستی کا تعلق تھا، ان کے ذریعے پروگرام ہوا۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ میں سندھ کے قوم پرست دانشوروں سے ان کی ملاقات کا انتظام کروں، اس سلسلے میں میں نے اس وقت کے کئی قوم پرست دانشوروں سے مل کر فاران ہوٹل میں ڈاکٹر صاحب سے ان کی ملاقات کا انتظام کیا، دانشوروں نے ڈاکٹر صاحب سے کافی سخت لہجے میں گفتگو کی، کہ پنجاب، سندھ کے ساتھ ساتھ، بلوچستان کا بھی استحصال کر رہا ہے، ہمارے لئے پاکستان سے جدائی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے سندھی دانشوروں سے براہ راست اتنی تلخ باتیں پہلی بار سنی تھیں، اس لئے وہ بہت زیادہ حیران ہو گئے، انہیں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ سندھ میں علمی اور ادبی حلقہ قوم پرستی کے احساسات اور جذبات میں بہت آگے نکل چکا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۱۹۸۷ع میں چند دنوں کے لئے کراچی آئے ہوئے تھے، حیدرآباد میں انکم ٹیکس کے ایک افسر سرفراز احمد خان ان کے دوست تھے، موصوف کے گہرے مذہبی مزاج ہونے کی وجہ سے میرے ساتھ بھی ان کی گہری دوستی پیدا ہو چکی تھی، سرفراز احمد صاحب نے مجھے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کا فون آیا ہے کہ،'' موسیٰ صاحب وقت نکال کر تین چار دن کیلئے کراچی آئیں اور میرے ساتھ رہیں'' ان دنوں جنگ کراچی اور جنگ لاہو وغیرہ میں میرے جدید اسلامی فکر اور اسلام کیلئے بہتر حکمت عملی اور قومی مسائل کے موضوع پر مضامین چھپ رہے تھے، ایک مضمون میں ڈاکٹر

صاحب کی فکر پر تنقید بھی کی گئی تھی، کراچی جا کر میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تین دن رہا، ڈاکٹر صاحب مجھے مقامی طور پر ہونے والے اجتماعات میں بھی اپنے ساتھ لے گئے، اور میرا تعارف بھی کرایا۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے دعوت دی کہ میں ان سے بیعت ہوکر ''تنظیم اسلامی'' میں شامل ہو جاؤں، میں نے عرض کیا کہ، جو شخصیت کسی اہل اللہ سے بیعت کر کے، ذاتی اصلاح کے مراحل سے نہ گذری ہو، میری نظر میں اسے دوسروں سے بیعت لینے کا حق نہیں، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میری بیعت، بیعت اصلاح نہیں، بلکہ بیعت جہاد ہے، ڈاکٹر صاحب سے اپنے تعلقات کے موضوع پر مزید تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں، یہ تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''عصر حاضر کی شخصیات، میری نظر میں'' میں پیش کی ہے۔

مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب، ۱۹۶۸ع کے آخر سے لیکر ۱۹۷۳ع تک جماعت اسلامی صوبہ سندھ کے سیکریٹری جنرل رہے، اسی دوران مجھے ان کے قریب رہنے کا موقعہ ملا، موصوف انتہائی ذہین، متحرک، اور دوسروں کو آگے بڑھنے کا موقعہ دینے والے، اور فرد کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے والی شخصیت تھے، ''الوحید'' میں لکھنا، اور اسکے بعد ''جسارت'' میں لکھنے کے لئے میری حوصلہ افزائی کرنے میں انکا اہم کردار ہے، مولانا موصوف، مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے شاگرد تھے، جو مفکر ہونے کے ساتھ عارف باللہ بھی تھے، لیکن وہ اپنے استاد کے اسلامی نصب العینی فکر اسے متفق نہ ہو سکے۔

۱۹۷۳ع کے آخر میں موصوف جماعت اسلامی کی سیاسی حکمت عملی سے اختلاف کی وجہ سے جماعت اسلامی سے جدا ہو گئے، وہ چار سال تک حیدرآباد کے میئر

بھی رہے، ضیاء الحق کے دور حکومت میں وفاقی حکومت میں وزیر بھی رہے، لیکن وہ اپنا گھر بھی نہ بنا سکے، سیشن کورٹ کے قریب ٹھنڈی سڑک پر جامع اسلامیہ کے نام سے مدرسہ تھا، جس کے دو کمروں کے گھر میں رہتے تھے، کافی عرصہ اسی گھر میں گذارا، وہ اپنے لئے گاڑی بھی نہ لے سکے۔

ان کا یہ مثالی کردار تھا، جو آج کے سیاسی کارکناں اور سیاستدانون کیلئے قابل تقلید ہے، مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب چونکہ، شخصی طور پر انتہائی متحرک فرد تھے، اس لئے ایم کیو ایم کے طاقتور بن جانے کے بعد انہوں نے مہاجروں کو متبادل قیادت دینے کے خیال سے ''آل پاکستان مہاجر کاؤنسل'' بنائی، جس میں نصرت مرزا جیسے دانشور شامل تھے، نصرت مرزا کے کہنے پر انھوں نے اس زمانے میں مہاجر مفادات کے تحفظ کے متعلق ''روزانہ جنگ'' میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا، ان مضامین کا مقصد مہاجروں کا رخ، ایم کیو ایم کی بجائے اپنی طرف تبدیل کرنا تھا، لیکن موصوف کے ان مضامین نے ایک تو سندھ کے علمی حلقے کو سخت ناراض کردیا، اور ان کے مہاجر قومی تحریک والے رخ کو نمایاں کر دیا، دوسرے یہ کہ ''آل پاکستان مہاجر کاؤنسل'' ایم کیو ایم کے مقابلے میں کوئی نمایاں کردار ادا نہ کرسکی۔

اس تجربے کے بعد موصوف نے ''مہاجر کاز'' والی کوشش کو پس پشت ڈال دیا، اور جماعت اسلامی سے نکلی ہوئی تنظیم ''تحریک اسلامی'' میں شمولیت اختیار کی، اس سے پہلے موصوف کچھ وقت ڈاکٹر اسرار احمد کے بھی قریب رہے، جاوید احمد غامدی صاحب (جن کی فکر میں اس وقت تک صحتمند اجزاء غالب تھے) ان کے ساتھ بھی کچھ وقت تک مل کر کام کیا۔

مولانا موصوف سے میرا تعلق ۱۹۶۹ع سے لیکر آخر تک قائم رہا، ایک بار مجھ سے پوچھا کہ ''میں تمھیں روزانہ عصر کے وقت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ؒ کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا ہوں، کافی وقت سے مسلسل آپ جارہے ہیں، ڈاکٹر صاحب سے آپ کیا حاصل کرنے چاہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ'' ڈاکٹر صاحب میرے لئے یونیورسٹی کی حیثیت رکھتے ہیں، اس یونیورسٹی سے میں راہ سلوک کا کورس کرنے کے لئے کوشاں ہوں یہ کورس دنیا کے سارے علوم اور فنوں پر بھاری ہے، اور سب سے زیادہ مشکل بھی۔

مولانا چونکہ، ذھنی طور پر تصوف کے قائل نہیں تھے، اسلئے میری بات کو پوری طرح نہ سمجھ سکے، کہا کہ مجھے تمہاری کتابیں ملتی رہتی ہیں، لیکن میں ''تصوف'' کے متعلق تمہارے موقف کو بالکل غلط سمجھتا ہوں۔

کافی وقت کے بعد ایک بار مولانا سے ملاقات میں، اسم ذات کے قلبی ذکر کے بارے میں گفتگو ہوئی، فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث شریف ہے، جس میں آپ نے ایک صحابی کو فرمایا کہ،'' بیٹا! اللہ کا دھیان جمایا کرو، تو اللہ کو اپنے سامنے موجود پاؤ گے'' کہا کہ، قلبی ذکر، شاید یکسوئی سے اللہ کے دھیان کو ایک جگہ مرتکز کرنے کا نام ہے، اس کے بعد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خانؒ کے بارے میں بتایا، کہ میں کافی عرصے سے ڈاکٹر صاحب سے صبح کی تفریح کرتا ہوں، ان سے ہر موضوع پر بات ہوتی ہے، ڈاکٹر صاحب اپنے بلند اخلاق اور عاجزانہ روش کی وجہ سے ان بزرگوں میں شامل ہیں، جن کا ذکر ہم کتابوں میں پڑھتے رہتے ہیں، میری نظر میں اس وقت پاکستان میں بمشکل کوئی ایسا بزرگ ہوگا۔

مولانا کا ایک فرزند، جو غیر معمولی طور پر ذہین تھا، لیکن پھر وہ ذہنی طور پر بیمار ہوگیا، اور شدید فکری انتشار میں مبتلا ہوگیا، وہ مجھے کئی بار ڈاکٹر صاحب کی مجلس میں نظر آیا، لیکن پھر انہوں نے اچانک آنا بند کر دیا، کچھ عرصہ بعد ان سے ملاقات ہوئی تو میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے مجھے ذہنی طور پر بہت فائدہ ہوا تھا اور میں فکری بحران سے تقریباً نکل آیا تھا، لیکن پھر والد صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی مجلس میں جانے سے روک دیا کہ تصوف کہیں تمہیں زیادہ معطل نہ کر دے۔

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی رواداری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کبھی کبھی جمعے کی نماز اور خطبے کیلئے وہ اپنی مسجد میں مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب کو مدعو کرتے تھے، اپنے مخالف نقطۂ نگاہ رکھنے والی شخصیت کو اپنے حلقے میں متعارف کرانے کی ایسی مثالیں معاشرے میں نہیں ملتیں، یاد رہے کہ مولانا کا مدرسہ اور ڈاکٹر صاحب کی خانقاہ ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

انتقال سے پانچ سات سال پہلے مولانا ندوی صاحب اپنے بڑے فرزند، جو کینڈا میں رہتے ہیں، ان کے اصرار پر موصوف کینڈا منتقل ہو گئے۔

زندگی کے وسیع تجربات اور نشیب و فراز سے گذرنے کے بعد آخر کار مولانا ندوی صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ اہل اللہ کی صحبت کے بغیر شخصیت اور مزاج میں تو ٹھہراؤ اور اعتدال پیدا ہونا مشکل ہے۔اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد موصوف نے کینیڈا سے حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کو ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں غائبانہ بیعت کرنے اور ذکر دینے کی درخواست کی۔

خط کی یہ نقل، مولانا کے ''تحریک اسلامی'' کے بعض مقامی ساتھیوں سے مجھے ملی

، جس پر مجھے ازحد خوشی ہوئی، کیونکہ مولانا عملی زندگی کے بے شمار تجربوں سے گذرنے اور جماعتی زندگی کے وسیع مشاہدوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے، یہ ڈاکٹر صاحب کے بھی آخری دن تھے، ڈاکٹر صاحب نے خط کا جواب اپنے پوتے حافظ منیر احمد خان سے لکھوایا، اور انہیں بھیج دیا، جس میں غائبانہ بعیت کرنے اور قلبی ذکر کی اجازت دی ہوئی تھی۔

پروفیسر علی نواز جتوئی صاحب کا ذکر کرنا بھول گیا، موصوف سندھ یونیورسٹی میں سندھی ڈپارٹمینٹ کے سربراہ تھے اور پیر ایرانی شاہ صاحب کے خلیفے بھی تھے، انتہائی نفیس قسم کے فرد تھے، برسوں تک ان سے تعلقات رہے، ۱۹۷۳ع میں جب اس وقت کے وزیر اعظم ذالفقار علی بھٹو صاحب نے سندھ میں قوم پرست تحریک کا زور توڑنے کیلئے شیخ ایاز کو سندھ یونیورسٹی کا وائیس چانسلر مقرر کیا تو پروفیسر علی نواز جتوئی صاحب نے احتجاجاً پروفیسر شپ سے استعفا دے دیا، غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب ، جو وفاقی حکومت میں وزیر تھے، اور ان کے قریبی عزیز بھی تھے، انہوں نے انہیں ایسا کرنے سے روکا، لیکن ان سے انہوں نے کہا کہ، شیخ ایاز کی ملحدانہ شاعری نے سندھ کے سینکڑوں ذہین افراد کو سیکیولر بنا دیا ہے، میں ایسے فرد سے یونیورسٹی میں کام نہیں کر سکتا۔

جتوئی صاحب نے اپنے شیخ پیر ایرانی شاہ صاحب کی گفتگو کو تین جلدوں پر مشتمل کتابوں میں قلم بند کرکے شایع کیا تھا، تصوف کے موضوع پر یہ نہایت اہم کتابیں ہیں، جتوئی صاحب کی ایک کتاب جو ان کے لکھے ہوئے قیمتی علمی مضامین پر مشتمل ہے،وہ ہمارے تعارف سے،''ویروں اور وھکرا'' کے نام سے شایع ہوئی تھی، یہ

کتاب انکے علم، ادب اور تحقیق میں بلند مرتبے کی نشاندھی کرتی ہے۔ڈاکٹر غلام علی الانا جیسے کئی افراد ان کے شاگرد رہے ہیں۔

میں نے محترم جتوئی صاحب سے شاہ صاحب کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی تھی، اس مقصد کیلئے کئی دن تک ان کے گھر پر جاتا رہا، لیکن معلوم ہوا کہ شاہ بھٹائی کے کلام کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے کسی حد تک سلوک کے مراحل کا طے کرنا ضروری ہے، کیونکہ شاہ کا رسالہ سلوک کے نصاب سے بحث کرتا ہے، سلوک طے کئے بغیر نہ تو شاہ صاحب کے کلام کی نوعیت اور معنویت کو سمجھا جا سکتا ہے، نہ ہی اس سے حقیقی فائدہ اور حلاوت حاصل ہوسکتی ہے، الحمدللہ، سلوک کے آخر میں جب میں نے شاہ صاحب کے کلام کو پڑھنا شروع کیا تو ایک ایک شعر کا مفہوم دل کی گہرائی سے نکلنا شروع ہوا۔

پروفیسر علی نواز جتوئی صاحب محقق ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقی صوفی بھی تھے، سادگی اور درویشی کا نمونہ، بچوں کی طرح معصوم صفت، جب بھی اس سے ملنے جائیں، وہ خوشی محسوس کرتے تھے، اور ہر مجلس میں تصوف کے کچھ نہ کچھ نکات ضرور بیان کرتے، میں سلوک کے دوران اکثر قبض وبیقراری کی شدید حالت میں رہتا تھا، ان سے اس بات کا ذکر ہوتا تھا تو کہتے تھے کہ ''ان حالات سے گذرے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

انٹرویو میں کسی جگہ مولوی محمد سلیمان طاہر صاحب کا بھی ذکر آیا ہے، موصوف انتہائی زرخیز ذہن کے مالک تھے، اگرچہ ان کا مطالعہ وسیع نہیں تھا، لیکن حالات ومسائل کے تجزیئے اور جماعتوں اور شخصیتوں کو سمجھنے کے معاملے میں ان کے تجزئے بہت قیمتی ہوتے تھے، موصوف ۱۹۷۱ع میں سکھر سے حیدرآباد منتقل ہوئے تھے، یہاں کچھ عرصہ محمد

بن قاسم ادبی سوسائٹی کی طرف سے فارغ رہے، اسکے بعد جماعت اسلامی ضلع حیدرآباد کے امیر بنے، میں چونکہ، ''جسارت'' کا مستقل تجزیہ نگار تھا، اس لئے جماعت اسلامی کے دفتر میں روزانہ ملاقات ہوتی تھی، روزانہ ہونے والی گفتگو میں ان کے کیے ہوئے تجزیوں سے مجھے بہت فائدہ حاصل ہوا، ان کے بیان کردہ، ایک،دونکتوں کو بنیاد بنا کر میں نے جسارت میں بہت کالم لکھے، موصوف سے برابر اچھے تعلقات رہے، لیکن آخری ۵،۷ سالوں میں بہت کم ملاقاتیں ہوئیں ۔

سوال: اپنے علمی اور نظریاتی کام کے دوران قابل ذکر واقعات وتجربات ہوں تو بتایئے۔

جواب: کافی واقعات وتجربات ہیں، جنہیں بیان کرنے کے لئے الگ سے کتاب چاہئے، کچھ واقعات بیان کرتا ہوں۔

ایک دن لیاقت میڈیکل کالج کے ایک شاگرد میرے پاس آئے، کہنے لگے کہ کالج میں دوقسم کی تنظیمیں اور ان کا لٹریچر موجود ہے، ایک قوم پرست تنظیمیں اور ان کا لٹریچر ہے، دوسرا ترقی پسند اور مارکسزم کی فکر ہے، میں بالکل خالی ذہن ہوں، میں چاہتا ہوں کہ اسلامی فکر پر میرا اعتماد مستحکم ہو، تاکہ میں کالج میں بھی کچھ کام کرسکوں، میں نے انہیں اپنی متعدد کتابیں دیں اور کہا کہ وہ مجھ سے مستقل رابطہ میں رہیں۔

یہ شاگرد بدین کے عبدالحفیظ سموں صاحب تھے، موصوف مجھ سے مسلسل رابطہ میں ہے، انہوں نے سندھی زبان میں شایع ہونے والی ہماری کتابیں پڑھ ڈالی، اس کے بعد انہوں نے میرے کہنے پر اور میری ترتیب کے ساتھ سارے جدید اسلامی مفکروں کی فکر کو پڑھ ڈالا، جس سے فکری طور پر وہ مستحکم ہوئے، کالج سے فارغ ہونے

کے بعد انہیں سرکاری ملازمت ملی، ہمارے ساتھ ان کا تعلق بہت کمزور ہوا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پیر بدیع الدین راشدی صاحب کی جماعت میں شامل ہیں۔ اس وقت وہ سندھ میں ان کی جماعت کے ذمہ دار ہیں اور اسے کافی وقت دیتے ہیں، اگرچہ مسلکی رنگ موجود ہے، لیکن کثرت مطالعہ کی وجہ سے مسلکی رنگ ایک حد تک ہی ہے۔

دوسرا واقعہ جو مشاہداتی نوعیت کا واقعہ ہے، وہ یہ ہے کہ جب پانچ سال تک ہماری کتابیں سندھ کے علمی حلقوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اساتذہ کے ہاں جاتی رہیں تو ہم نے طے کیا کہ ان پڑھنے والوں سے معلوم تو کریں کہ ان تک ہماری کتابیں پہنچ رہی ہیں یا نہیں، اگر پہنچ رہی ہیں تو برائے کرم اپنے تاثرات سے واقف فرمائیں، اس کے لئے ہم نے کتاب کے ساتھ ایک خط ارسال کیا اور کارڈ بھی کہ اس کارڈ پر اپنے تاثرات لکھکر ارسال فرما دیں۔ پانچ سو افراد میں سے لگ بھگ دوسو افراد نے جوابات دیئے۔ ایک سو سے زائد افراد نے کتابوں کو پسند کیا اور اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی سفارش کی۔ بعض افراد نے لکھا کہ ہمیں کتاب پڑھنے کی فرصت نہیں ملتی، لیکن ٹیبل پر مطالعہ کا ذوق رکھنے والے اساتذہ اور طالب کتاب دیکھتے ہیں، ہم وہ کتاب انہیں کو دے دیتے ہیں، اس طرح آپ کی کتاب ضایع نہیں ہوتی، آپ مطمئن رہیں، بعض افراد نے لکھا کہ آپ نے ہمارے ساتھ فکری وعلمی جنگ شروع کردی ہے، ٹھیک ہے اس سے ہمیں آپ کا نقطہ نگاہ سمجھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ بہت کم افراد نے کتاب بند کرنے کے لئے لکھا۔

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک دوست نے سندھ کے ممتاز ادیب پروفیسر غلام محمد لاکھو صاحب کا پتہ دیا کہ ''بیداری'' سندھی انہیں ضرور بھیجیں، مجھے پہلے سے ان کا پتہ

مطلوب تھا، موصوف کی خدمت میں بیداری کے چند شمارے پہنچے تو انہوں نے خط لکھا کہ میں آپ کی فکر کو چالیس سال سے پڑھ رہا ہوں، آپ اور میرے درمیاں کسی پہلو سے بھی تو فکری مشابہت اور ہمہ آہنگی نہیں، فکر اور سوچ کا کوئی ایک پہلو بھی تو ایسا نہیں، جہاں آپ سے مطابقت ہو، اس لئے برائے کرم آئندہ مجھے بیداری ارسال کرنا بند کردیں۔

میں نے انہیں خط کے جواب میں دو نکتے لکھے، ایک یہ کہ مخالف اہل علم میں اتنا حوصلہ ضرور ہونا چاہئے کہ وہ ان کا نکتہ نگاہ پڑھ سکے۔ اس سلسلہ میں نظریاتی طور پر تنگ نظری اور تعصب صحیح نہیں ہے۔ میں نے آپ کی فکر پڑھی ہے اور پڑھنا چاہتا ہوں، آپ میں بھی اتنی وسعت فکری ہونی چاہئے، میں نے انہیں دوسرا نکتہ یہ لکھا کہ آپ کے والدین نے کتنی محبت سے آپ کا نام غلام محمد رکھا، وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا بیٹا محمد ﷺ کا حقیقی غلام بنے گا۔ اب اگر ان کی روح کو یہ معلوم ہو کہ ہمارے بیٹے نے محمد ﷺ کی راہ سے جداگانہ راہ اختیار کی ہے تو انہیں کتنی اذیت ہوگی۔

موصوف نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا، لیکن اس کے دوچار سال بعد پریس کلب حیدرآباد میں مولانا خیر محمد نظامانیؒ کی شخصیت پر محترم عبدالجبار نظامانی صاحب کی کتاب کی تقریب رونمائی ہوئی، مولانا نظامانی صاحب جہاں سندھ کے بہت بڑے صحافی تھے، وہاں وہ اسلامی فکر کے بڑے علمبردار بھی تھے۔ محترم غلام محمد لاکھو صاحب نے تقریب کی صدارت کی۔ میں تقریب کی آخری صف میں تھا، بیشتر مقرروں نے مولانا نظامانی صاحب کی شخصیت پر میری طرف سے شایع ہونے والے کام کا ذکر خیر کیا۔ محترم غلام محمد لاکھو صاحب نے کہا کہ محترم محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے اہم موضوعات پر

مولانا کے منتخب ادارتی نوٹ ایک جمع کرکے چار سو صفحات کی کتاب ''تنقیدوں وتجویزوں'' کے نام سے شایع کی ہے۔ اس کتاب کو دوبارہ نئے نام اپنی صحیح ترتیب کے ساتھ شایع ہونا چاہئے، موسیٰ بھٹو صاحب نے ابواب اور موضوعات کے تحت کتاب ترتیب دی ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔

ایک واقعہ محمد اسلم پردیسی صاحب کا ہے، موصوف سے ہمارے ایک عزیز عبدالغفار بھٹو صاحب کے ذریعہ سے تعلق ہوا، شروع میں ان کا تعلق بریلوی مکتبہ فکر سے تھا، اس کے بعد وہ جماعت اسلامی کی فکر سے متاثر ہوئے، بعد ازاں اہل حدیث مکتبہ فکر کے قریب ہوئے، آخر میں وہ جماعتہ المسلمین میں شریک ہوئے۔ ہمارے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے، ہم نے ان کو جماعتہ المسلمین کی فکر کے منفی پہلوؤں سے آشنا کرنے کی کوشش کی، لیکن جماعتہ المسلمین نے قرآن سے ان کے تعلق کو دیکھتے ہوئے ان کے لئے اپنے نقطہ نگاہ سے فہم قرآن کا انتظام کیا، روزانہ ان کے ایک صاحب صبح کے وقت کوئی آدھ گھنٹہ ان کو ترجمہ قرآن سکھانے کے لئے آتے رہے، اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ان کی وسعت فکری ووسعت نظری ختم ہوگئی۔

انہوں نے میری باتوں سے متاثر ہوکر کہا کہ میں اپنے گھر میں اہل علم کی ایک مجلس رکھنا چاہتا ہوں، جس میں جماعت المسلموں کے امیر مسعود احمد بی ایس سی بھی شریک ہوں گے، آپ بھی شریک ہوں، میں چاہتا ہوں کہ ان کے سامنے یہ باتیں پیش ہوں، تاکہ مجھے دونوں مکتبہ فکر کو سمجھنے اور ایک طرف ہونے میں مدد ملے، متعین وقت پر میں حیدرآباد سے کراچی پہنچا، بدین سے ڈاکٹر عبدالحفیظ سموں صاحب بھی آئے، دوچار اور اہل علم بھی موجود تھے، لیکن یہ مجلس گرما گرم گفتگو پر ختم ہوئی، اس کے

بعد موصوف جماعتہ المسلموں کے ساتھ پوری طرح یکسو ہوگئے، اس طرح کی مجالس تمام طور پر بحث ومباحثہ ہی کی نذر ہوجاتی ہیں۔

جماعتہ المسلموں کی فکر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو فرد جماعتہ المسلموں میں شامل نہیں، وہ مشرک ہے، اس کی نماز جنازہ پڑھنا، وہ چاہے باپ ہی کیوں نہ ہو، حرام ہے، اس طرح کے خاندان سے شادی کا رشتہ قائم کرنا بھی حرام ہے۔

یہ ساری باتیں جماعتہ المسلموں کے امیر صاحب کے دست راست سے سنی پڑی، یعنی ان کی نظر میں جماعت المسلموں کے علاوہ پوری امت مشرک ہے اور سب جہنمی ہیں۔

یہ فکر دراصل خوارج کی فکر ہے، بلکہ خارجیوں سے زیادہ خطرناک فکر ہے، اپنے ایک مخلص دوست کو جماعتہ المسلموں میں جاتے ہوئے دیکھکر سخت دکھ ہوا۔ اس مجلس میں جماعتہ المسلموں کے امیر کو دیکھنے اور ان کو سننے کا بھی موقعہ ملا۔

شیخ ایاز صاحب کے حوالے سے بھی ایک اہم واقعہ ہے، سندھی ادبی بورڈ کا سہ ماہی رسالہ مہران بہت علمی، ادبی اور تحقیقی نوعیت کا رسالہ ہے، اس رسالہ نے ۱۹۶۴ء میں (جب کہ محمد ابراہیم جویو صاحب بورڈ کے سیکریٹری تھے) ''مشرقی شاعری کی فنی قدروں کے رجحانات'' کے عنوان سے ایک ضخیم نمبر نکالا، جس میں شیخ ایاز کی اس وقت کی ملحدانہ شاعری کو جواز فراہم کرنے کے لئے بڑے بڑے صوفی شعراء کے حالت سُکر کے کلام کو ایک جگہ جمع کیا گیا تھا اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ جب مشرقی شاعری کے یہ سرتاج اللہ، دین ومذہب کے بارے میں وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو شیخ ایاز کہہ رہا ہے تو آخر شیخ ایاز ہی مجرم کیوں؟

سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۴ء میں شائع ہونے والے اس نمبر کو غالبا ۱۹۹۲ء میں کتابی صورت دی، اب ہمارے لئے ضروری تھا کہ اتنی مسموم کتاب کے اثرات کا توڑ کریں اور اس کا جواب دیں۔ ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل شیخ صاحب اور شیخ عبدالرزاق راز صاحب نے روزنامہ مہران (جس کے اس وقت مدیر سید سردار علی شاہ صاحب تھے) ان دونوں ادیبوں نے اس نمبر کا لگ بھگ سو قسطوں میں تفصیلی جواب دیا تھا، ہم نے کوشش کرکے وہ مضامین حاصل کئے اور ''بیداری'' میں بھی قسط وار شایع کئے تو اسے کتابی صورت بھی دی، یہ کافی ضخیم کتاب ہے، ساتھ ساتھ ۱۹۹۳ء کے بیداری کا ایک خاص نمبر بھی شایع کیا، شیخ ایاز صاحب نے مجھے خط لکھا کہ آپ کا ''بیداری'' کا خاص نمبر مجھے محمد ابراہیم جویو صاحب نے دیا، انہوں نے کہا کہ محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے اس بار شیخ ایاز کے خلاف نمبر نکالا ہے، میں نے محترم جویو صاحب سے کہا کہ محمد موسیٰ بھٹو نے جس شیخ ایاز کے خلاف نمبر نکالا ہے، وہ شیخ ایاز مرچکا ہے، حالانکہ شیخ ایاز صاحب کی ساری ذہنی نشوونما محمد ابراہیم جویو صاحب نے کی تھی، شیخ ایاز کا یہ خط اس وقت کے ''بیداری'' کے شمارے میں چھپ چکا ہے، اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ شیخ ایاز کی اس دینی حمیت کی وجہ سے اس سے خاص فضل کا معاملہ فرمائیں گے۔ (آمین)

سوال: ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب کی شخصیت کے بارے میں آپ کے تاثرات پوری طرح سامنے نہیں آئے؟

جواب: محترم عبدالغفار سومرو صاحب کی شخصیت، سرکاری افسروں کیلئے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہے، وہ مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر رہے، میرپور خاص اور

حیدرآباد ڈویژن کے کمشنر بھی رہے۔ صوبائی حکومت اور اس کے بعد مرکزی حکومت میں سیکریٹری بھی رہے، آخر میں صوبۂ سرحد کے چیف سیکریٹری بھی مقرر ہوئے، لیکن ان اہم عہدوں پر تعیناتی کے باوجود ان کی طبیعت اور مزاج میں تبدیلی نہیں آئی، علمی مزاج اور دینی حس پوری طرح قائم رہی، موصوف نے اپنے علمی اور تخلیقی کام کے ذریعے سندھی ادب میں جو اضافہ کیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ بلکہ وہ فکر کے میدان میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب سے بھی آگے ہیں۔ علامہ اقبال کے خطبات کا سندھی زبان میں اچھا ترجمہ کرکے انھوں نے اپنی فکری وسعت اور فلسفیانہ سوچ کا مظاہرہ کیا ہے۔ اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے ساتھ، ساتھ اعلیٰ نوعیت کے علمی اور تحقیقی کام کیلئے وقت نکالنا، اسے جاری رکھنا، یہ عادت ان کی فطرت سلیمہ کے اجزاء کی نشاندھی کرتی ہے، ان کی اس فطرت کو رکھنے میں امام غزالیؒ، مولانا رومی اور شاہ بھٹائی کے مسلسل مطالعہ نے اہم کردار ادا کیا ہے، ملت کی ان ممتاز شخصیات سے علمی تعلق قائم کرنے سے بھی فرد مادہ پرستی کی دلدل میں گرنے سے بچ کر اپنے دینی اثاثے کو برقرار رکھ سکتا ہے، موجودہ دور کے سرکاری افسران کیلئے یہ ایک اہم پیغام ہے، جو ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب کی شخصیت اپنے عمل کے ذریعے دے رہی ہے۔

سوال: دوسرے دوست اور ساتھی، جن کا ذکر کرنے سے قارئین کو فائدہ پہنچ سکتا ہو، ان کا ذکر خیر ہو تو بہتر ہے؟

جواب: ایسی شخصیات میں عبدالوحید قریشی صاحب محمد ادریس راجپوت صاحب غلام محمد کھوکر مرحوم، پروفیسر اسرار احمد علوی صاحب، شیخ محمد یوسف صاحب، ڈاکٹر عبدالجبار عابد صاحب اور ڈاکٹر شہاب الدین غازی صاحب وغیرہ شامل ہیں۔

جماعت اسلامی کی جن شخصیتوں کے کردار نے مجھے متاثر کیا ہے، ان میں عبدالوحید قریشی صاحب نمایاں ہیں۔

موصوف ساٹھ سال سے لوگوں کی بے غرضانہ طور پر خدمت سرانجام دے رہے ہیں، سماجی خدمت کے کام میں حیدرآباد میں ان کی مثال نہیں ملتی، کوئی بھی شخص آئے، وہ اپنے کام کے سلسلہ میں اسپتال یا سرکاری آفیسوں میں انہیں آسانی کے ساتھ لے جاتا ہے، ان کے جانے سے ڈاکٹر اور افسراں ان کی وجاہت کی حامل شخصیت اور سینے کو چھپانے والی ڈاڑھی اور عرصہ سے اس چہرے سے مانوس ہونے کی وجہ سے اس کا لحاظ کرتے ہیں،اپنوں اور غیروں کی شادی غمی میں شرکت کرنا، ان کے معمولاتِ زندگی میں شامل ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ان کاموں میں صرف ہوا ہے، وہ حیدرآباد جماعت اسلامی کے روح رواں ہیں، جامعۃ العلوم الاسلامیہ منصورہ سندھ کے پچھلے بیس ۲۲ سال سے سیکریٹری ہیں، اس کے بیشتر معاملات کو سلجھانے میں اہم کردار انہی کا ہوتا ہے، مہینہ میں ایک دوبار وہاں ضرور جاتے ہیں، چونکہ میں بھی ادارہ تعمیر ملت منصورہ اور وہاں کی مقامی شوریٰ کا ممبر ہوں، اس لئے وہ مجھے بھی لے جانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں، لیکن پچھلے کچھ عرصہ سے اپنی علمی مصروفیات اور اعصابی تھکاوٹ کی وجہ سے میں معذرت کرنے پر مجبور ہوتا ہوں، ایک سبب یہ ہے کہ علمی مزاج کا حامل فرد عام طور پر علمی کام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے، اور یہ کام اس کی توانائیوں کو نچوڑ لینے کا باعث ہوتا ہے۔ موصوف مدرسہ ریاض العلوم جو میرپورخاص روڈ پر واقع ہے، اس کے بھی سرپرست اور سیکریٹری ہیں۔

سندھی زبان میں تفہیم القرآن کی اشاعت کے کام میں میاں محمد شوکت صاحب

کے بعد ان کا اہم کردار ہے، انہوں نے ایک زمانہ میں سندھی زبان میں متعدد کتابوں کی اشاعت کا کام بھی سرانجام دیا ہے۔

عبدالوحید قریشی صاحب کی بعض خوبیاں ایسی ہیں، جو قابل رشک ہیں، ایک تو وہ اپنے دوستوں، ساتھیوں اور دوسروں کی گلا وغیبت سننے کے روادار نہیں، اس کام کو وہ سخت معیوب سمجھتے ہیں اور اس پر عامل بھی ہیں، موجودہ دور میں جب کہ دوسروں کی تحقیر اور گلا وغیبت معاشرہ کا حصہ بن گئی ہے، جس نے افراد معاشرہ کو اندر سے توڑ پھوڑ دیا ہے، اس دور میں نمایاں شخصیت کی طرف سے اس طرح کی باتوں کی حوصلہ شکنی کرنا، گلا وغیبت کرنے والوں کو اس سے روکنا، یہ لائق تعریف بات ہے۔

عبدالوحید قریشی صاحب کی دوسری بڑی خوبی صبر وتحمل وبردباری ہے، مزاج کے خلاف بڑے سے بڑے واقعہ پر ان کا ردعمل نرم ہوتا ہے۔ موصوف غصہ کا اظہار بھی بڑی محبت اور نرمی سے کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں کبھی بھی تیزی، شدت اور اپنی شخصیت کی وجاہت کا اظہار نہیں ہوتا، وہ اپنے مخالفوں کو بھی یک طرفہ طور پر معاف کردیتے ہیں، ان کے اسی مزاج کا نتیجہ ہے کہ اللہ نے انہیں سب کے ساتھ چلنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور طویل عرصہ تک خدمت دین اور خدمت خلق کی سعادت بھی۔

محترم عبدالوحید قریشی صاحب کی شخصیت میں کافی رواداری موجود ہے، انہوں نے قبہ مسجد کے ساتھ ایک ہال قائم کیا ہے، جہاں ہر طرح کی مذہبی، دینی اور علمی تقریبات جماعتی تفریق کے بغیر ہوتی ہیں اور اعزازی طور پر ہوتی ہیں۔

اس وقت ان کی عمر ۷۷ سال سے زیادہ ہے، لیکن وہ جوانوں کی طرح کام کرتے ہیں، صبح دس بجے سے رات کو دس بارہ بجے تک مصروف عمل رہتے ہیں۔

غالبا یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے، ہم لطیف آباد حیدرآباد میں مولانا خلیل الرحمٰن پانی پتی صاحب کے ساتھ سکھر سے حیدرآباد میں ان سے عربی وفارسی پڑھنے کے لئے آئے تھے، اس وقت ان کا مدرسہ بالکل ابتدائی نوعیت کا تھا، رہائش اور خوراک کا انتظام نہ ہونے کے برابر تھا، موصوف ایک دن ایک وجاہت کی حامل شخصیت کو مدرسہ میں لے آئے اور ان کو مدرسہ کی تعمیر کے حوالے سے تفصیلات بتائیں، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ عبدالوحید قریشی صاحب ہیں، جو جماعت اسلامی حیدرآباد کے سیکریٹری ہیں، اس کے بعد سے ان سے جو تعلق قائم ہوا ہے تو وہ الحمدللہ اب تک قائم ہے۔

ان کی شخصیت میں والدین کی تربیت کا اثر بہت گہرا ہے، ان کے والدین کا اہل اللہ سے گہرا تعلق تھا، اہل اللہ کی گہری صحبت کے یہ اثرات ہوتے ہیں کہ ان کی اولاد بھی ان کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔

عبدالوحید قریشی صاحب کی شخصیت میں کافی وسعت ظرفی موجود ہے، موصوف تبلیغی جماعت اور صوفیائے کرام کے خدمت دین کے کام کو بھی اہم کام سمجھتے ہیں۔

محمد ادریس راجپوت صاحب بھی ہمارے ادارہ کے ساتھ تعاون کرتے رہے ہیں، پانی کا بحران جو اس وقت سندھ میں شدید خشک سالی کا موجب بن گیا ہے، اور شہروں کو پینے کا صاف پانی تک ملنا دشوار ہوگیا ہے، موصوف نے اس موضوع کے سارے پہلوؤں پر بہت تفصیل سے مضامین لکھے ہیں، جو برسوں تک ''کاوش'' اخبار میں چھپتے رہے ہیں، یہ مضامین پانی کے بحران کے مسئلہ کو سمجھنے، پنجاب اور چھوٹے صوبوں بالخصوص سندھ اور پنجاب کے درمیاں پانی کے تنازع کو سمجھنے، اس بحران کو مستقل طور پر حل کرنے کے لئے بہتر عملی منصوبہ بندی، پانی کے عالمی بحران کے موضوع پر یہ نہایت

قیمتی مضامین ہیں، یہ مضامین ہمارے ادارہ نے مختلف عنوانات سے کتابی صورت میں شایع کئے ہیں۔

ایک فرد نے سندھ کے پانی کے بحران کے موضوع پر اتنا عمدہ اور قیمتی کام کیا ہے کہ قوم پرستوں کی ساری تنظیموں اور زمینداروں پر مشتمل آبادگاروں کی نمائندہ تنظیموں نے اس سلسلہ میں سوائے بیانات کے کچھ بھی نہیں کیا، بلکہ آبادگار تنظیموں سے وابستہ بعض بڑے زمینداروں سے موصوف نے کہا کہ ہم نے تمہارے موقف کو تقویت دینے کے لئے حقائق اور اعداد وشمار سے کتابیں لکھی ہیں، آپ کم از کم اپنی مرکزی باڈی سے وابستہ افراد تک ہماری کتاب پہنچائیں، اس سلسلہ میں ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں تو حیرت کی بات ہے کہ آبادگاروں کی تنظیم کے نام پر بڑے بڑے وڈیروں نے کوئی ایک کتاب بھی نہیں خریدی۔

محمد ادریس راجپوت صاحب سندھ حکومت میں آب پاشی کے سیکریٹری رہ چکے ہیں، پانی کے موضوع پر حقیقت پسندانہ مضامین نہ لکھنے کی شرط پر انہیں بڑے بڑے عہدے آفر کئے گئے، لیکن موصوف نے کہا کہ میں نے جس موضوع پر زندگی بھر پڑھا ہے، عملی مشاہدہ کیا ہے اور جس بات کو میں صحیح سمجھتا ہوں، میں صحیح بات کو پیش کرنے سے کس طرح رک سکتا ہوں۔

موصوف دینی حمیت وجذبہ کے صاحب بھی ہیں، صاحب کردار شخصیت ہیں، ہمارے ساتھ محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔

سندھ میں اعلیٰ سرکاری ملازموں میں محمد ادریس راجپوت صاحب جیسے ایماندار، دیانتدار، دینی اعتبار سے اپنے حصہ کا کردار ادا کرنے والے افسر بہت کم دیکھے گئے،

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں سعادت دارین نصیب فرمائے۔

ڈاکٹر غلام سکینہ شیخ صاحبہ بھی کافی عرصہ سے ''بیداری'' سے تعاون کررہی ہیں، موصوفہ گرلز کالج میں پروفیسر ہیں، ان کو ہم نے جب بھی کسی موضوع پر مضمون لکھنے کے لئے کہا، انہوں نے وقت نکال کر مضمون لکھکر دیا، اور اردو سے اچھے مضامین کے سندھی ترجمہ کے لئے بھی وہ ہر وقت تیار رہتی ہے۔

پروفیسر غلام سکینہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قیل وقال سے زیادہ عمل کی غازی ہیں، ذکر وفکر کے مجاہدوں سے گزری ہیں، ان کے والد صاحب بزرگ تھے، ان کے گھر میں مراقبہ کا مستقل حلقہ ہوتا تھا، جس میں پابندی سے شریک ہوتی رہی ہیں، وہ فکری اعتبار سے بھی بہتر فکر کی حامل ہیں، بیداری سندھی واردو کے ایک ایک مضمون کو پڑھنے کے لئے کوشاں ہوتی ہیں، سندھی بیداری کے بعض اہم مضامین پر وہ تفصیلی تبصرے بھی کرتی رہتی ہیں، ڈاکٹر صاحبہ کالج میں اپنی خاتون ساتھیوں اور طالبات میں دعوت دین کا بھی بہتر طور پر فریضہ سرانجام دینے کے لئے کوشاں ہیں، ان کے اہم مضامین پر مشتمل ایک کتاب ان کے تعاون سے ہماری طرف سے چھپی ہے، ان کی متعدد کتابیں شایع ہوئی ہیں۔

سندھ میں اس طرح کی باعمل متحرک اور علمی اعتبار سے اپنے حصہ کا کردار ادا کرنے والی دینی خواتین بہت کم ہیں، جب کہ ترقی پسند حلقہ نے اس طرح کی بہت ساری خواتین تیار کی ہیں۔

سوال: سندھ کے سیکولر فکر کے بانی محمد ابراہیم جویو صاحب نے آپ کی شخصیت اور فکر کو بنیاد بنا کر ''سیکولرزم اور عقلیت پسندی'' کے نام سے کتاب لکھی، آپ نے اس

کا کافی تاخیر سے جواب دیا، اس کا سبب؟

جواب: میں نے غالبا بیداری کے ۱۹۹۷ء کے شمارے میں محمد ابراہیم جویو صاحب کی شخصیت اور ان کے کام کے بارے میں ۱۳ صفحات پر مشتمل مضمون لکھا، اس مضمون کے جواب میں بعض سندھی اخبارات نے جویو صاحب کے دفاع اور میری مخالفت میں کافی کچھ لکھا، ان کے جواب میں دلیل کم، غصہ زیادہ تھا، جویو صاحب نے اپنے ساتھیوں کی ایک مجلس میں کہا کہ موسیٰ بھٹو صاحب یقیناً ہمارے حریف ہیں اور سندھ میں سب سے بڑے حریف ہیں، لیکن انہوں نے میری مخالفت میں جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے، وہ نہایت سائشتہ ہے، ان کی تحریر میں کہیں بھی اشتعال نظر نہیں آتا۔ لیکن ہمارے ساتھیوں نے ان کے خلاف اپنے کالموں میں جو زبان اختیار کی ہے، وہ ہمارے جیسے نظریاتی لوگوں کے لئے زیبا نہیں۔

اس کے بعد جویو صاحب نے میرے مضمون کے جواب میں پوری کتاب لکھی، ویسے بھی جویو صاحب ایک عرصہ سے دیکھ رہے تھے کہ محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے ہماری فکر کے خلاف ہمہ پہلو علمی کام کیا ہے اور وہ اپنے اس لٹریچر کو اعزازی طور پر پھیلا رہے ہیں، چنانچہ جویو صاحب نے ہماری فکر کے جواب میں مذکورہ عنوان سے کتاب لکھی، اس کتاب کے دو ایڈیشن چھپ گئے، میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، جب سیکولرزم اور عقلیت پسندی کا تیسرا ایڈیشن شایع ہوا تو دوستوں نے اصرار کیا کہ آپ اس کا تفصیلی جواب دیں، اس لئے کہ جویو صاحب نے اس عمر میں اپنی پوری فکر شرح وبسط کے ساتھ اس کتاب میں پیش کردی ہے، میں چونکہ مثبت کام کرنے کو زیادہ مفید سمجھتا ہوں، اس لئے میں نے اس کتاب کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا، لیکن جویو

صاحب کی کتاب کی تیسری اشاعت کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ قوم پرستی، ترقی پسندی، سیکولرزم، مارکسزم اور اسلامی فکر کی اصلیت جیسے موضوعات پر ایک ہی کتاب میں مباحث شامل ہوجائیں، ہماری کتاب پونے تین سوصفحات پر مشتمل ہے، جو ''سیکولرزم اورعقلیت پسندی ایک علمی جائزہ'' کے نام سے ہے، کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا ہے، دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی تیاری اور فکرمندی ہے، الحمدللہ ہماری یہ کتاب ایسی ہے کہ جس شاگرد یا اہل علم کو سندھی زبان میں ہماری دوسری کتابیں پڑھنے کا موقعہ نہ مل سکا، وہ یہ کتاب پڑھ لے گا تو انشاء اللہ ان پر جدید نظریات کی نوعیت واصلیت اور اسلام کی صداقت واضح ہوجائے گی۔

سوال: آپ اہل علم ساتھیوں کا ذکر کررہے تھے۔

جواب: غلام محمد کھوکھر صاحب، مولانا خیر محمد نظامانی صاحب کے مختلف اخبارات میں کام کرتے رہے، روزانہ عبرت میں بھی نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔'' الوحید'' میں وہ پہلے دن سے ہی نیوز ایڈیٹر رہے، مولانا خیر محمد نظامانی صاحب دو بار مستعفی ہوئے تو ان کی غیر موجودگی میں ''الوحید'' کے ایڈیٹر بھی رہے، ہفتیوار'' وینجھار'' کے تقریباً ۱۵ سال تک مدیر رہے، موصوف ایک اچھے صحافی تھے، لیکن اس سے زیادہ ان کی طبیعت میں سادگی، ملنساری، عاجزی، انکساری، سب کے ساتھ حسن ظن رکھنا، دوسروں کی عیب جوئی اور غیبت سے پرہیز جیسے اوصاف موجود تھے، جو آج کے دور میں نایاب ہو گئے ہیں، وہ دینی حمیت کے جذبے سے بھی سرشار تھے۔

شیخ محمد یوسف صاحب ۱۹۷۰ع میں ''الوحید'' میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے،'' الوحید'' کے بعد کافی دوست مختلف شعبہ جات میں چلے گئے، شیخ

صاحب فوج میں افسر کی حیثیت سے داخل ہوئے، جلد ہی سکھر میں پبلک سکول کے پرنسپل بن گئے، اس وقت پروفیسر اسداللہ بھٹو کے ساتھ تنظیم فکر ونظر'' میں کافی تعاون کیا، بلکہ تنظیم کے کام کو ترقی دینے اور اس وقت کے صدر ضیاء الحق صاحب سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ رکھنے اور تنظیم کے دستور کو تیار کرنے میں بنیادی کردار شیخ محمد یوسف صاحب کا ہی تھا، لاڑکانہ میں کیڈٹ کالج کی شروعات میں کالج کے پروجیکٹ ڈائریکٹر اور پرنسپل رہے، برسوں تک اس حیثیت سے کام کیا، کیڈٹ کالج کی طرف سے سالانہ اردو، سندھی اور انگریزی میں ہر سال ضخیم میگزین بھی شایع کرتے رہے، بھٹائی اور اقبال کی شاعری پر بھی کتابیں لکھی اور کالج کی طرف سے شایع کروائی، پبلک سکول سکھر، کیڈٹ کالج لاڑکانہ، پبلک سکول حیدرآباد، پبلک سکول گڈاپ کراچی میں پرنسپل رہے، عارضی حکومت میں وفاقی وزیر بھی رہے۔

ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جہاں بھی رہے، وہاں بچوں کی اسلامی معلومات میں اضافہ کے ساتھ ان کی بہتر تربیت کیلئے خاص کردار ادا کرتے رہے، بچوں میں قرآن کی سورتوں اور احادیث کو یاد کرنے کیلئے علمی مقابلے کرانا، زیادہ سے زیادہ احادیث یاد رکھنا، ذہین طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرنا، استادوں اور شاگردوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، اس کام کیلئے ضخیم میگزین نکال کر ان کے مضامین کو شایع کرنے کی صورت پیدا کرنا، موصوف ان سارے معاملات میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں، موجودہ دور ایسا ہے کہ جس میں عام طور پر اداروں کے سربراہ دین کے معاملے میں خود کو غیر جانبدار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ سیکولر فضا میں ان کی حیثیت متاثر نہ ہو، لیکن شیخ یوسف صاحب اس معاملے میں حساس ثابت ہوئے ہیں،

ہر ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے بچوں کی تربیت اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کیلئے وہ ہرممکن حد تک کام کرتے رہے ہیں۔ موصوف انتظامی صلاحیتوں کے اعتبار سے اہم شخصیت ہیں، کمزور سے کمزور تعلیمی ادارے کو بھی زوال سے نکال کر ترقی دلانا اور ہر اعتبار سے اس کو مستحکم کرنے کی ان میں بڑی صلاحیت موجود ہے، یہ کہنے میں کوئی دروغ نہیں کہ وہ تعلیمی اداروں کو بنانے اور چلانے کیلئے سحر انگیز خوبیوں کے مالک ہیں۔

پروفیسر اسرار احمد علوی، صاحب علم، صاحب اخلاق و کردار شخصیت ہیں، عربی اور فارسی کے فاضل ہیں، سیرت پاک پر انہوں نے سندھی زبان میں بہتر علمی کی کتاب لکھی ہے، جو مہران اکیڈمی کی طرف سے شایع ہوئی ہے، سیرت کے موضوع کے علاوہ بھی ان کا مطالعہ وسیع ہے بڑے چشموی بزرگوں کے ساتھ بعیت کا تعلق رہا ہے، جو سیرت و کردار میں پاکیزگی کا نمونہ تھے، جو زہد استغنا، اور اہل دنیا سے بے نیازی اور فنائیت میں اکابر بزرگوں کی مثل تھے، برسوں تک ایسے بزرگ کی صحبت رہی، ایسے بزرگ کو قریب سے دیکھنے کے بعد بزرگی کے موجودہ معیار اور مظاہر کو وہ بزرگی نہیں، بلکہ دکانداری سمجھتے ہیں، ان کی مجلس میں صحیح بزرگی اور بزرگی کے نام پر دکاندارانہ بزرگی کی روش کا اکثر ذکر ہوتا رہتا ہے، پروفیسر اسرار احمد علوی صاحب، علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بہتر مقام پر فائز ہیں،ان کا زیادہ تر وقت علمی، ادبی، دینی اور روحانی نوعیت کی گفتگو میں گذرتا ہے، موصوف شکارپور میں ہر فرد کو، ہر وقت دستیاب ہیں، دوست اکثر شکارپور اور شکارپور سے باہر انہیں بلاتے رہتے ہیں، چونکہ ان کا مشاہدہ وسیع ہے، جماعتی اور گروہی دائروں سے بلند ہیں، اس لئے ان کی شخصیت کے

ذریعے نئی نسل کو اچھا فائدہ حاصل ہو رہا ہے،

ڈاکٹر عبدالجبار عابد صاحب قوم پرستی کے عروج کے دور میں ''رہبر ڈائجسٹ'' کے نام سے سندھی زبان میں ماہنامہ نکالتے رہے، اس رسالے کے مواد اور سرکولیشن کیلئے موصوف سندھ کے دور دراز علاقوں کا دورہ کرتے رہے، اس رسالے میں انہوں نے قربان علی بگٹی صاحب کے ترقی پسند دانشوروں کی فکر پر تنقیدی مضامین شایع کئے، جس سے قوم پرست اور کمیونسٹ حلقے سے عابد صاحب کی کشمکش شروع ہو گئی ''رہبر ڈائجسٹ''رسالہ ۱۳سال تک شایع ہوتا رہا، اس رسالے نے سندھی زبان میں ادبی اعتبار سے اچھا کردار ادا کیا، اس کے بعد موصوف نے اسلامی ادیبوں کو پلیٹ فارم مہیا کرنے کیلئے ''رہبر ادبی سوسائٹی'' (راس) قائم کی، جس کی کافی عرصے تک نشستیں ہوتی رہیں، عابد صاحب نے بعد میں سندھ یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے کام کیا، وہاں سے ریٹائر ہوئے اور چند سالوں تک وہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

موصوف نے کافی ادبی نوعیت کی کتابیں لکھی ہیں، میرے ساتھ انکا دوستانہ تعلق ۱۹۷۰ع سے قائم رہا ہے، کبھی کسی بات پر ناراض ہوجائیں تو سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں، منانے کی ساری کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، لیکن کچھ وقت گذرنے کہ بعد خود ہی تعلقات کی بحالی شروع کر دیتے ہیں، عابد صاحب کی طرف سے سرکاری رسالے ''نئی زندگی کا'' ''ہجری نمبر'' بھی شایع ہوا، جو ایک یادگار کارنامہ ہے، انہوں نے جشن رہبر کے جلسے بھی کروائے۔

موصوف دوستوں کے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں، دوستی کو اچھی طرح نبھاتے

ہیں، شاعر بھی اچھے ہیں اور ادیب بھی اچھے ہیں، لیکن میرا اپنا ادبی ذوق کمزور ہونے کی وجہ سے ایسے دوستوں کی شاعری اور ادبی کام سے استفادہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے، اپنے فکری اور نظریاتی میلان اور تصوف کے مزاج کی وجہ سے اپنی دنیا ہی کچھ مختلف ہے، مزاج کی اس تشکیل کو نہ سمجھنے کی وجہ سے دوستوں کو زیادہ وقت دینا مشکل ہوجاتا ہے، جس کی وجہ سے بعد میں ناراضگیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

ڈاکٹر شہاب الدین غازی صاحب علمی، ادبی اور نظریاتی مزاج کے حامل ہیں، سندھ کی درسگاہوں اور علمی حلقے میں سیکیولر نظریاتی فکر کی نوعیت اور اس کی سنگینی اور اسلام کو لاحق نظریاتی چیلنج کا ڈاکٹر صاحب کو شروع سے پورا ادراک حاصل ہے، اس سلسلے میں وہ ''بیداری'' سندھی میں مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔

موصوف ۱۹۸۵ع کے دور میں اسلامی جمعیت طلبہ سندھ کے کافی عرصہ تک ناظم رہ چکے ہیں، سندھ میں محمد نعمان بھٹو صاحب کے بعد جمعیت کے سب سے زیادہ فعال اور متحرک ناظم ڈاکٹر غازی صاحب ہی رہے ہیں۔

ایسی شخصیت کے ساتھ، سندھ میں علمی اور عملی طور پر کام کرنے کی بہت سی توقعات وابستہ تھیں، اگر جماعت اسلامی بروقت ڈاکٹر صاحب کی صلاحیتوں سے استفادہ کرتی تو وہ سندھ میں اسلامی نکتہ نگاہ سے موثر کردار ادا کر سکتے تھے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ان حالات میں تعلیم سے فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب اسلام آباد منتقل ہو گئے، وہاں اپنا کلینک کھولا، جماعت اسلامی سے تعلق قائم رہا، لیکن سیاست میں زیادہ الجھنے اور جماعت کی لیڈر شپ کو ملنے والی مراعات اور خوبصورت گاڑیوں کی صورتحال

نے ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں تلخی پیدا کردی۔

حقیقت یہ ہے کہ، غیر معمولی ذہین فرد خاص طور پر موجودہ دور میں، اگر کسی حقیقی اللہ سے صحبت کا تعلق قائم نہیں رکھے گا، تو اس کے لئے ذہنی دباؤ سے بچنا اور مزاج میں اعتدال پیدا ہونا مشکل ہے، یہ ایسا نکتہ ہے جسے ہم اپنے مضامین میں باربار دہراتے رہے ہیں، کیونکہ فرد کی اخلاقی اور روحانی تربیت میں اسی فیصد کردار، صاحب دل شخصیت کی صحبت کار رہا ہے، فرد کی شخصیت کا یہ فطری تقاضا ہے، اور اپنی فطرت سے فرار ممکن نہیں۔

سوال: کیا آپ نے سندھ کے بڑے تعلیمی اداروں میں طلبہ میں براہ راست کام کرنے کی بھی کوشش کی ؟

جواب: سندھ یونیورسٹی اور مہران یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے دینی اور مذہبی گھرانوں کے افراد نے ہماری کتابوں کی وجہ سے ہم سے رابطہ رکھا اور ملاقات کے لئے بھی آتے رہے، یہ سلسلہ ۱۹۸۵ع سے شروع ہوا، ایسے طالب علموں میں حمداللہ بھٹو، عبدالخالق شیخ، نذیر احمد مہر، اور غلام عباس مہر جیسے ذہین شاگرد بھی شامل تھے، ۱۹۸۶ع کے شروع میں میرا لاڑکانہ کا پروگرام تھا، وہاں عبدالخالق شیخ صاحب ملے، جو انجنیئر نگ یونیورسٹی کراچی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور یونیورسٹی کی طرف سے چھٹی پر گھر آئے تھے، عبدالخالق صاحب نے ہماری کچھ کتابیں پڑھ لی تھی، وہ مجھ سے ملے، کہا کہ آج ہم مغرب کی نماز کے بعد نوجوانوں کے ساتھ آپ کا پروگرام رکھنا چاہتے ہیں، آپ جدید حالات، قوم پرستی اور ترقی پسند فکر کے پس منظر میں، اسلامی فکر کے

موضوع پر گفتگو کریں گے، تقریر کے بعد سوال وجواب کا موقع دیا جائے گا، چونکہ، چھٹیاں تھیں، شاگرد گھر آئے ہوئے تھے، عبدالخالق صاحب نے اپنے ایک دوست کا گھر خالی کروا کر اس میں پروگرام رکھا جس میں لگ بھگ، سو، سوا سو نوجوان موجود تھے، میری گفتگو کے بعد ہر قسم کے سوال و جواب بھی ہوئے۔

عبدالخالق صاحب اپنے دینی جذبے اور تحرک کی بنا پر میرے قریب آتے گئے، اس کے بعد جلد ہی انہوں نے نذیر احمد مہر، غلام عباس مہر صاحب اور دوسرے نوجواں کے ساتھ مل کر ''سندھ اسلامک مشن'' کے نام سے تنظیم قائم کی، عملی طور پر شاگردوں میں کام کرنے والی اس تنظیم کی سرپرستی کا شرف مجھے حاصل ہوا، ہم نے لطیف آباد حیدرآباد میں کرائے پر مکان لیا تھا، وہ عمارت ''اسلامک مشن'' کے مرکز کے طور پر استعمال ہونے لگی، کچھ شاگرد وہاں رہتے بھی تھے، ہفتے میں ایک بار ''درس قرآن'' کی محفل بھی ہوتی تھی، نفس کی اصلاح کے حوالے سے تقریباً روزانہ گفتگو ہوتی تھی۔ اس زمانے میں میں نے ''سچائی'' کے نام سے ایک ماہنامے کا اجراء کیا تھا، عبدالخالق صاحب کراچی سے ہفتے میں دوبار حیدرآباد آتے تھے، ''سندھ اسلامک مشن'' کی سرگرمیاں کافی بڑھ گئی تھیں، حالات اور مسائل پر عہدیداروں کے بیانات بھی چھپتے رہے، اخبارات ان کے بیانات کو نمایاں طور پر شایع کرتے رہے۔

عبدالخالق صاحب اور نذیر احمد صاحب کی کوششوں سے اچھے نوجوان جمع ہوگئے، ایک بڑا پروگرام شکارپور میں ہوا، جس کا انتظام نذیر احمد صاحب نے کیا، ایک پروگرام کراچی میں ہوا، جو پورے دن کا پروگرام تھا، جس میں کچھ تربیتی نوعیت کی نشستیں تھیں،

ایک پروگرام، جو مغرب کی نماز سے لیکر رات دیر تک چلا، اس میں کراچی کے نامور دانشور خالد ایم اسحاق صاحب، مولانا محمد طاسین صاحب اور لاہور سے محمود مرزا ایڈوکیٹ جو بڑے دانشور تھے، انھوں نے تقریریں کیں۔

لاڑکانہ میں بھی کافی پروگرام ہوئے، جن میں، میں شریک ہوا، عبدالخالق صاحب خط وکتابت کے ذریعے اپنی سرگرمیوں کی اطلاع دیتے رہے، انہوں نے ایک خط میں لکھا کہ، ''آپ کے ساتھ محبت کا ایسا تعلق قائم ہوگیا ہے کہ آپ کی جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا'' لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ تنظیم کے ذمیداروں پر قوم پرستی کا ماحول شدت سے اثر انداز ہو رہا ہے، دوسرے یہ کہ وسائل کی کمی اکثر رہتی تھی، تیسرے یہ کہ تنظیم کو وقت دینے کی وجہ سے میرا اپنا علمی کام متاثر ہونے لگا، ان تین اسباب کی وجہ سے میں نے تنظیم کی سرپرستی سے معذرت کر لی۔

عبدالخالق شیخ صاحب سے ۱۹۹۳ع تک تعلق قائم رہا، لیکن پھر ان کو اچھی ملازمت مل گئی اور بڑے افسروں سے دوستی کی وجہ سے ان کے مزاج میں ایسی تبدیلی آئی کہ اس کے بعد انھوں نے رابطہ ہی ختم کر دیا اور، ۱۹۹۳ع سے لیکر یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور ان کی مصروفیات کیا ہیں؟ اُس وقت اسلامی حمیت، دینی جذبہ، اور اسلام کیلئے تحرک، جو ان میں تھا، وہ قابل دید تھا، عبدالخالق سے سارے دوست یہی توقع رکھتے تھے کہ، وہ مستقبل میں اسلام کیلئے اہم کردار ادا کرینگے، لیکن اچھا عہدہ اور افسروں کی سی شان وشوکت والی زندگی اور افسروں کی صحبت نے ان کی دینی حمیت کو زیر و زبر کر دیا، ان سارے دوستوں میں سے نذیر احمد صاحب کبھی کبھار اپنے

حالات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں، نیک والدین کے اثرات کی وجہ سے ان کے مزاج اور شخصیت میں گہرے مذہبی اثرات موجود ہیں، اور وہ اثرات انھیں ماحول کا حصہ بننے سے روکے ہوئے ہیں۔

سوال: اس زمانے کے طالب علموں میں سے کون سے افراد آپ سے مسلسل رابطے میں ہیں؟

جواب: حمادالله بھٹو صاحب اور عنایت اللہ مہر صاحب۔ حمادالله بھٹو صاحب لاڑکانہ میں دعوتی اور سماجی خدمت کا اچھا کام کر رہے ہیں، ایسا کام جو قابل رشک ہے، ان کے کراچی کے مختلف سماجی اداروں سے تعلقات و روابط ہیں، جن کے تعاون سے وہ غریبوں کی مالی مدد کرنا، مختلف دیہات میں بچوں کی دینی تعلیم کے لئے مدارس قائم کرنا، اور ان مدارسوں کی نگرانی کرنا، لاڑکانہ میں کئی سالوں سے ہفتوار محفل مراقبہ کا انعقاد کرنا، یہ اور اس طرح کے کافی کام ہیں، جو حمادالله بھٹو صاحب کر رہے ہیں، وہ لاڑکانہ کے گورمنٹ ٹیکنیکل کالج میں ڈپٹی پرنسپل ہیں۔

عنایت اللہ مہر صاحب، بیس بائیس سال تک مشہور سندھی اخبار میں کالم نگاری کا کام کرتے رہے، جس اخبار میں اللہ، اسلام اور اسلامی ملت کا نام لینا گناہ تھا، اس اخبار میں انتہائی خوبصورتی اور بہتر حکمت عملی سے اسلام اور اسلامی ملت کی بات کرتے رہے، ہماری مختلف اردو کتابوں کے سندھی ترجمے کئے ہیں، جو سندھی بیداری میں قسط وار شایع ہوتے رہے، یہ خدمت وہ آج تک انجام دے رہے ہیں، انھوں نے شکارپور میں مختلف دوستوں کو ذکر وفکر کی راہ پر لگایا ہیں، میرے ساتھ مسلسل رابطے میں ہیں۔

سوال: ارباب نیک محمد صاحب کافی عرصے سے روزانہ ''کاوش'' میں کالم نگار کی حیثیت سے کام کررہے ہیں، سندھ کے ٹی وی چینل پر بھی کافی عرصے سے ان کے پروگرام آتے رہتے ہیں، وہ قوم پرستوں اور ترقی پسندوں کی طرف سے ہونے والے اکثر پروگراموں میں شریک ہوتے رہتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: مولوی نیک محمد صاحب ۱۹۶۸ع میں ''مدرستہ الاسلام'' میرپور خاص میں پڑھتے تھے، اس وقت ان کی عمر بمشکل سات آٹھ سال ہوگی، میں بھی اس وقت استاد حافظ محمد حیات صاحب کے پاس مولوی کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، اس کے بعد وہ ''سندھ اسلامک مشن'' میں اہم کردار ادا کرتے رہے، میری خواھش تھی کہ وہ کسی اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں، تاکہ ان کی صلاحیتیں اسلام کی لئے بہتر طور پر استعمال ہو سکیں، الحمدالله، جلد ہی پنجاب کے سرائیکی علائقہ کے بزرگ حضرت محمد حسین صاحب سے ان کا تعلق قائم ہوا (وہ بزرگ، ایک سو دس برس کی عمر میں بھی ہر مہینے عمرکوٹ کے دورے پر آتے تھے) مولوی نیک محمد صاحب پر ان کی شخصیت کی صحبت کا اچھا اثر ہوا، اس کے بعد ان کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا،'' کاوش'' جیسے اخبار میں کافی سالوں سے ان کے کالم کا چھپنا بہت اہمیت رکھتا ہے، ان کے لکھے ہوئے مضامین کے ذریعے کسی نہ کسی حد تک ان کا موقف'' کاوش'' کے قارئین تک پہنچتا رہتا ہے۔

ٹی وی چینل پر آنا بھی انشاالله فائدہ مند ثابت ہوا ہوگا، ٹی وی چینل سے تعلق نہ ہونے کی وجہ سے مجھے اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے، البتہ حد سے زیادہ رواداری اور

اسلام سے بیزار حلقوں کے پروگراموں میں مستقل طور پر شرکت کرتے رہنا، یہ بات میرے لئے تشویش کا باعث رہتی ہے، کیونکہ ایسا کرنے سے دوسروں سے متاثر ہونا، اور حمیت دین کے مضمحل ہونے کا خدشہ لاحق رہتا ہے، دوسروں سے متاثر ہونا فرد کی فطرت میں شامل ہے، اس لئے غلط فکر کے حامل افراد سے زیادہ ملنا جلنا اور مسلسل ان کی محفلوں میں شریک ہونا، اور ان کی غلط گفتگو سنتے رہنا، نقصاندہ ہے، فرد کا ماحول سے متاثر ہوئے بغیر رہنا مشکل ہے، اس لئے قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ، **ومن یتولھم فانه منھم** (جو ان سے دوستی رکھے گا، وہ انہی میں شمار ہوگا) دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ، **ولا ترکنو الی الذّین ظلموا فتمسکم النار** (ان ظالموں کے قریب بھی نہ جاؤ، ورنہ آگ تمہیں چھوئے گی) لیکن ان کام کی افادیت کے بھی کچھ پہلو بھی ہیں، جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ایک یہ کہ، سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد کمیونسٹ دانشوروں میں دین و مذھب کی طرف پلٹنے کا رجحان بڑھا ہے، ان سے ذاتی تعلقات کے نتیجے میں ان کی بہتر طور پر رہنمائی کی جا سکتی ہے، اس سلسلے میں معلوم ہوا ہے کہ، انہوں نے کئی پرانے کامریڈوں کو راہ راست پر لانے میں کامیابی حاصل کی ہے، یہ بات میرے لئے خوشی کا باعث ہے، لیکن اس میں توازن تب ہی پیدا ہوسکتا ہے، جب اہل اللہ کی صحبت اور ان سے محبت کا تعلق مستحکم ہوگا۔

میری عرصے سے خواہش اور کوشش رہی ہے کہ نیک محمد صاحب جیسا ذہین شخص مجھ سے مستقل رابطے میں رہے، تاکہ جدید مادّی نظریات کو سمجھنے اور سمجھانے کے سلسلے میں مطالعے میں وسعت کی صورت پیدا میں ہو، اس لئے کہ ان کے مضامین

میں جدید نظریات اور سیکولرزم کی ہمہ جہت طوفانی لہروں کا ذکر برائے نام ہوتا ہے، وہ کتابی مطالعے کے بارے میں سست واقع ہوئے ہیں، جبکہ اخبارات کے مطالعے کے معاملے میں کالم نگاروں میں شاید ہی کوئی ان سے سبقت لے سکے، وہ پچھلے تیس سالوں سے تین تین، چار چار گھنٹے روزانہ اخبارات کے مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔

مولوی نیک محمد صاحب طبعی اعتبار سے درویش اور فقیر منش انسان ہیں، ہر مذہبی اور دینی طبقے کو دل میں جگہ دینے والے ہیں، اور اسلام اور ملت کا دل میں درد رکھنے والے دانشور ہیں، لیکن شخصیتوں، جماعتوں اور روز مرہ کے حالات کے متعلق زیادہ معلومات ہونے کی وجہ سے اس معلومات کے اظہار کو روکنا مشکل ہے، یعنی وہ گفتگو میں تیز تر ہیں، حالانکہ صوفی کو کم سے کم گفتگو کی وصف کا حامل ہونا چاہئے۔

مولوی نیک محمد صاحب حیدرآباد آتے رہتے ہیں، لیکن نہ مجھے اپنی زیارت کرواتے ہیں اور نہ ہی اپنے آنے کی اطلاع دیتے ہیں، اپنے معمر دوست کو اس طرح نظر انداز کرنا انہیں زیب نہیں دیتا، بہر حال اخلاص واستقامت سے کام کرتے رہیں، اور اہل اللہ سے اپنے رابطے کو مستحکم رکھیں تو وہ سندھ کی سیکولر فضا میں بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں، الحمداللہ، اب تک وہ بہتر کام کرتے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں استقامت نصیب فرمائے۔

سوال: آپ نے پروفیسر اسداللہ بھٹو صاحب اور پروفیسر عبدالخالق سہریانی صاحب (جن سے آپ کے قریبی تعلقات رہے ہیں) کام اور حکمت عملی کا کوئی خاص ذکر نہیں کیا، ان دونوں کی فکر اور حکمت عملی کے بارے میں کچھ بتائیں ؟

جواب: ان دونوں دوستوں کے کام اور حکمت عملی کے متعلق تفصیل ہماری کتاب ''جدید سندھ کے دانشور اور عالم'' کتاب میں موجود ہے، پروفیسر اسداللہ بھٹو صاحب کی شخصیت پر میری مرتب کردہ کتاب، جو ''تنظیم فکر و نظر'' کی طرف سے شایع ہوئی ہے، اس میں زیادہ معلومات موجود ہیں۔

سوال: ہمارے قارئین کیلئے ان شخصیت کے متعلق کچھ معلومات دیں ؟

جواب: پروفیسر اسداللہ بھٹو صاحب انتہائی متحرک فرد تھے، علمی اور ادبی مجاذ پر ان کا کیا ہوا کام اہم ہے، ان پر کام کرنے کی دھن سوار تھی، انہوں نے کافی کتابیں شایع کیں، اور سندھ گیر سطح پر کانفرنسیں بھی منعقد کیں، اسلام دوست ادیبوں، شاعروں اور لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا، اور یہ سارا کام ترقی پسند اور قوم پرست تحریک کے عروج کے دور میں کرنا، یہ ان کا بڑا کارنامہ تھا۔

موصوف کا آخر میں حضرت مولانا عبدالکریم قریشی رح (بیر شریف والے) اور ان کے حلقے کے عالموں سے تعلق قائم ہوا، لیکن ان کے ساتھ یہ تعلق روحانی فیض کے حصول کے لئے نہیں تھا، بلکہ جماعت اسلامی سے عدم تعاون کے اظہار کے بعد تنظیم کی عملی طور پر سرپرستی کی خاطر تعاون تھا۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی قائم کردہ تنظیم کے ساتھیوں کو اخلاص واستقامت سے صحیح سمت میں کام کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

پروفیسر عبدالخالق سہریانی صاحب سندھ میں اسلامی حلقے کے بڑے دانشور ہیں، اور بہت متحرک اور فعال شخصیت ہیں، ہم نے موصوف کی لکھی ہوئی تین کتابیں،

''علاقائی مسائل کے بارے میں اسلام کا موقف'' ''قوم پرستی اور قومیت'' اور فرقیواریت کے موضوع پر شایع کی ہیں، موصوف نے ان نازک موضوعات پر بہترین علمی بحث کی ہے، جس سے ان کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی عمر ۸۰ سال سے کچھ زیادہ ہے، اس وقت بھی وہ متحرک ہیں، ادیبوں اور علمی افراد کے ساتھ رابطہ رکھ کر، ان کو کام کے لئے تیار کرنا، سیرت کانفرنس منعقد کرنا، دورے کرنا، اپنی کتابوں کی اشاعت کیلئے کوشش کرنا وغیرہ یہ انکا ایسا کردار ہے، جو دوسروں کیلئے لائق تقلید ہے۔

سوال: آپ سے علمی کام میں معاونت کرنے اور بیداری سندھی میں لکھنے والے جو افراد ملے، کیا ان کے نام بتائینگے؟

جواب: محرم علی ٹگر صاحب، عبدالھادی تھیبو صاحب، علی اکبر راہموں صاحب، مولانا محمد رمضان مہیری صاحب، عبدالقدیر کانجوں صاحب، عاصم عباسی صاحب، عبدالجبار عبد صاحب، عبدالغنی زرین دایو صاحب، فضل اللہ مہیسر صاحب یہ ساتھی کافی عرصہ تک کتابوں کے تراجم کے ساتھ بیداری سندھی میں بھی لکھتے رہے ہیں، بعد میں انور جوکھیو صاحب، آمنہ حامد زبیدی صاحب، ڈاکٹر غلام سکینہ صاحب کا تعاون حاصل رہا، ان ساتھیوں کے علمی تعاون سے ہی ہم کافی کتابیں شایع کر سکے ہیں، اور ۲۷ سال سے ''بیداری سندھی'' کا لگا تار سلسلہ جاری ہے، اصل مدد اور نصرت تو اللہ ہی کی ہے، میں ان سب ساتھیوں کا تہہ دل سے مشکور ہوں اور ان کے لئے دعا گو بھی۔

البتہ ہمارے کام کو باقائدہ چلانے کے لئے ایسا فرد جو زیادہ وقت دے سکے،

اب تک ایسا کوئی دوست نہیں مل سکا، اس بات کی فکر مندی ہے، تاکہ ہمارے ادارے کے کام کے مستقل جاری رہنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔

سوال: آپ نے ایک دور میں، روزنامہ ''کاوش'' میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا، ''کاوش'' جیسا بڑا اخبار، جس نے سندھ میں سیکیولر فکر کو فروغ دینے میں بڑا کردار ادا کیا ہے، اس میں آپ کے اسلامی اعتبار سے علمی اور نظریاتی مضامین کیسے شایع ہوئے۔

جواب: کاوش اخبار کے چیف ایڈیٹر (اب ایڈیٹر) قاضی محمد اسلم صاحب (جو علی قاضی کے بڑے بھائی ہیں) ان سے میرے ۳۵ سالہ پرانے تعلقات رہے ہیں، لیکن پچھلے ۲۵ سالوں سے وہ'' کاوش'' کے کراچی کے دفتر منتقل ہو گئے ہیں، جس کی وجہ سے ان سے ملاقاتوں سلسلہ باقی نہیں رہا، قاضی صاحب کا ذھنی طور پر کمیونسٹ فکر سے کوئی تعلق نہیں، وہ اسلامی فکر کو صحیح سمجھتے ہیں، میری ان سے کافی علمی نشستیں ہوتی رہی ہیں، میں کافی عرصے سے کاوش میں کمیونسٹ اور مادہ پرست فکر پر مضامین پڑھتا رہا تھا، کراچی جا کر ان سے اس سلسلے میں بات کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا تھا، میں نے انہیں ایک تفصیلی خط لکھا، جس کی کاپی ان کے چھوٹے بھائی علی قاضی کو بھی بھیج دی، جس کے تقریباً ایک ہفتے بعد وہ حیدرآباد آئے، مجھے اطلاع ملی تو میں ان سے ملنے ان کے گھر گیا اور انھیں عرض کیا کہ، علی قاضی صاحب نے تو کاوش کو بالکل مادہ پرست اور سیکولر فکر کا ترجمان بنا دیا ہے'' کاوش'' میں اسلامی فکر کے موضوع پر لکھنا گناہ بن گیا ہے، کئی دوستوں نے شکایت کی ہے کہ ہم'' کاوش'' میں حالات و مسائل پر اسلامی اور

ملی نقطہ نگاہ پیش کرتے ہیں، لیکن ترقی پسند دانشور، جو کاوش پر قابض ہیں، وہ مضامین شایع ہونے نہیں دیتے، میں نے یہ بھی کہا کہ ملک کے سارے قومی اخبارات حالات و مسائل کے متعلق اسلامی اور ملی نقطۂ نگاہ کو اہمیت دیتے ہیں اور ان موضوعات پر سارے قومی اخباروں میں اچھے مضامین اور کالم چھپتے رہتے ہیں، جبکہ آپ کی موجودگی میں '' کاوش'' اس سعادت سے محروم ہے، اسلام سے آپ کی ذاتی ہمدردی اس وقت کام نہیں آئیگی تو پھر کب کام آئی گی؟ قاضی اسلم صاحب نے میرا نقطۂ نگاہ اچھی طرح سنا اور کہا کہ میں آپ کی سندھی اور اردو کتابیں اور سندھی بیداری بھی پڑھتا رہتا ہوں، آپ اگر '' کاوش'' میں باقاعدہ ہفتہ وار مضمون کا سلسلہ شروع کریں تو اس سے '' کاوش'' میں حالات ومسائل پر اسلامی موقف آنا شروع ہو جائیگا، مذہبی افراد کے لکھے ہوئے مضامین عام طور پر علمی اعتبار سے کاوش میں چھپنے کے قابل نہیں ہوتے، اس لئے وہ شایع نہیں ہو پاتے، لیکن آپ تو کاوش میں باقاعدگی سے لکھ سکتے ہیں، اس طرح میں نے '' کاوش'' میں۱۹۹۴ع سے ۱۹۹۸ع تک ہفتہ وار مضمون لکھے، لیکن پھر میری مصروفیات بڑھ جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

سوال: آپ کے دوسرے ساتھی، جن کا آپ ذکر اور تعارف کرانا ضروری سمجھتے ہوں۔؟

جواب: اہم ساتھیوں میں مولانا محمد رمضان مہیری صاحب ہیں، جو عالم وفاضل ہونے کے ساتھ فقیر منش اور درویش صفت شخصیت بھی ہیں، عربی اور فارس کے ماہر ہیں، مولانا رومی کا پورا کلام سندھی زبان میں ترجمہ کیا ہے، جو ''سندھیکا'' ادارے کی

طرف سے شایع ہوا ہے، ہمارے ادارے کی کئی کتابیں ان کی محنت کا حاصل ہیں، موصوف عملیات کے ماہر بھی ہیں، معاشرے کے وہ افراد جو انتہائی پرشاں حال اور بیماری میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں،انہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس بیماری میں مبتلا ہیں، انھیں ہم مولانا موصوف کی طرف رجوع کرنے کیلئے کہتے ہیں، موصوف ان کی ہر ممکن حد تک مدد کرتے ہیں، انہوں نے باقائدہ سلوک بھی طے کیا ہے، سلوک طے کرنے والے فرد میں اخلاص، درویشی، سادگی، توکل، قناعت، اللہ کی مخلوق سے محبت اور انہیں زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی خوبیاں از خود آجاتی ہیں، موصوف میں یہ اوصاف موجود ہیں، آج سے تقریباً دس سال پہلے، جب ان کی عمر ۵۰ سال تھی، میں نے انہیں عرض کیا کہ ''آپ ہائی سکول کی ملازمت چھوڑ دیں، باقی عمر اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت میں گذاریں'' انہوں نے میری بات مان کر درخواست لکھ کر اپنے محکمے کے بڑے افسر کو بھیج دی، اور ان کے پاس روبرو بھی پہنچے،ڈائریکٹر صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ آپ سروس مکمل کریں، سروس کی تکمیل کے بعد آپ کو تقریباً ۵۰ لاکھ کی رقم بقایاجات ملے گی،مہیری صاحب نے کہا کہ'' مجھے پچاس لاکھ ملیں یا پچاس کروڑ روپے، مجھے اب سروس نہیں کرنی'' وہ لوگوں کے کام فی سبیل اللہ کرتے ہیں۔

شیخ ایاز کا فرزند سرمد ایاز صاحب اعصابی اور دماغی کمزوری کا شکار ہے، اور دینی اور اصلاحی مسائل پر زیادہ سے زیادہ سوال کرتے رہنا ان کی مجبوری ہے، میں نے اپنی عمر رسیدگی اور ذھنی تھکاوٹ کے سبب لگاتار سوالوں کے جواب دینے سے ان سے

معذرت کی، اور انہیں مولانا محمد رمضان مہیری صاحب سے رابطہ رکھنے کا کہا۔سرمد ایاز نے ان سے تعلق رکھا، اور اب وہ ان سے مستقل رابطے میں ہیں،روزانہ کبھی دس منٹ تو کبھی آدھا گھنٹہ گفتگو کرتے رہتے ہیں، سرمد صاحب کے کہنے پر وہ کھور واہ (ضلع بدین) سے دوبار ان سے ملاقات کیلئے شکارپور بھی جا چکے ہیں۔

مولانا محمد رمضان مھیری صاحب کی سادگی، درویشی اور خدمت خلق کے کئی واقعات اس قسم کے ہیں، آج کے دور میں اس قسم کے درویش کا ملنا انتہائی مشکل ہے، وہ مسکین طبیعت کی شخصیت ہیں، اپنی خواہشوں کو فنا کرنے والے اور صاحب توکل بھی۔

ہمارے علمی کام میں معاونت کرنے والا دوسرے دوست محرم علی ٹگر صاحب تھے، جو فوت ہو چکے ہیں، انہوں نے ۱۹۸۵ع سے ہمارے کہنے پر کئی اہم علمی کتابیں اردو سے سندھی میں ترجمہ کر کے دیں، ان کا کہنا تھا کہ میں شہرت سے ڈرتا ہوں، اس لئے ان ترجمہ کی ہوئی کتابوں میں میرا نام شامل نہ کریں تو مہربانی ہو گی، ہم نے پانچ سات کتابیں، جن کا انہوں نے ترجمہ کیا تھا، دوسروں کے نام سے شایع کیں، موصوف واپڈا میں چیف انجنیئر تھے،لیکن ان کے سرکاری افسروں سے دوستانہ تعلقات برائے نام تھے، وہ شادی اور غمی کی تقریبات میں وقت ضایع کرنے سے گھبراتے تھے، شریف اور نیک افسر تھے اور نیک افسروں کے سوا دوسروں سے دوستی کے تعلقات نہیں رکھتے تھے، دینی کتب کے مطالعے کیلئے روزانہ کافی وقت نکالتے تھے،کم از کم سو سوا صفحات پڑھنا ان کا روز کا معمول تھا، رشوت سے دور تھے، قرآن کی کئی تفاسیر کا مطالعہ کر چکے تھے،فقہی نوعیت کے مسائل پر اچھی معلومات رکھتے تھے، ان سے ۲۵ سال تک تعلقات

رہے، ہمارے ماہنامہ ''بیداری'' کے پروف بھی پڑھ کر دیتے تھے، وہ بڑے کار آمد فرد تھے، دعوتی کام کی فکر مندی تھی، جس کے لئے ہر دم کوشاں رہتے، میں نے ان کے انتقال پر ان کے کام کے بارے میں ''بیداری'' میں تفصیلی مضمون لکھا تھا، جو ہماری اردو کتاب ''عصر حاضر کی شخصیات میری نظر میں'' میں شامل ہے۔

تیسرے دوست عبدالھادی تھیبو صاحب ہیں، جو ۱۹۸۵ع سے ہمارے ساتھ علمی تعاون کر رہے ہیں، ہماری شایع کی ہوئی کئی کتابوں کا ترجمہ انہون نے کیا ہے، 'بیداری سندھی'' میں بھی وہ کافی عرصے سے اچھے مضامین کا ترجمہ کرکے دیتے رہے ہیں، اپنی بیشتر مصروفیات کے باوجود وہ ہمارے ساتھ علمی تعاون کے لئے ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔

۱۹۸۶ع میں ''مطالعہء فطرت'' کے نام سے میں نے ایک کتاب لکھی، جو ایک اردو کتاب کا ترجمہ تھا، اسلام کو سمجھنے کیلئے وہ ایک اہم کتاب تھی، ۱۹۷۵ع کے بعد یہ میری پہلی سندھی تحریر تھی۔

لگاتار اردو میں لکھنے کی وجہ سے میری سندھی زبان کمزور ہو چکی تھی، میں نے انہیں عرض کیا کہ مہربانی فرما کر میری اس کتاب کی سندھی زبان درست کر کے دیں، تاکہ سادہ اور آسان سندھی زبان میں لکھنے اور کتابوں کے ترجموں پر نظر ثانی کرنے میں مجھے آسانی ہو، موصوف نے میری کتاب کی ہر سطر کو تبدیل کر کے نئے سرے سے لکھا، انہوں نے پوری کتاب پر اس طرح محنت کی، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہر زبان کا اپنا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، ہر زبان کے مزاج اور اسلوب کو سمجھے بغیر ترجمہ

کرنا صحیح نہیں، ایسا کرنے سے اصل مصنف کی تحریر کی روح متاثر ہوتی ہے، عبدالھادی صاحب حال حیات ہیں، کئی دینی اور خیرو بھلائی کے کاموں میں مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں استقامت عطا فرمائے۔

آمنہ حامد زبیدی صاحبہ بھی ہمارے ساتھ علمی تعاون میں اہم کردار ادا کرتی رہتی ہیں، ''بیداری سندھی'' کیلئے بے شمار مضامین کا ترجمہ کر چکی ہیں، وسیع مطالعے کی حامل خاتون ہیں، اردو اور سندھی کی اچھی لکھنے والی اور مترجم ہیں۔

انہوں نے سلطان باہو کے کلام کا سندھی میں ترجمہ کیا، جسکی تشریح میں نے کی ہے، مضامین کا یہ سلسلہ شروع میں سندھی بیداری میں شائع ہوا، سندھی میں کتاب بھی چھپی، اس کے بعد میں نے انہیں کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے کہا، انہوں نے دو تین ماہ میں کتاب کا مکمل ترجمہ کر کے دیا، جو ''بیداری اردو'' کے ساتھ ساتھ اردو میں کتابی صورت میں بھی شایع ہوا ہے۔

''بیداری سندھی'' کیلئے وہ ہمارے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرتی رہتی ہیں، انہوں نے شاہ لطیف کے منتخب کلام کی تشریح بھی کی ہے، امام غزالی کی ایک اہم کتاب، اللہ کا حیرت انگیز نظام جو کائنات سے متعلق ہے، جس کا انہوں نے سندھی میں ترجمہ کیا ہے، یہ دونوں کتابیں انہوں نے دعوتی نقطۂ نگاہ سے اپنی طرف سے شایع کی ہیں، ہمارے ادارے نے ان کی ترجمہ کی ہوئی دو کتابیں ''مراقبہ'' اور ''اکابر سندھی صوفیاء کے کلام کی تشریح'' کے نام سے کتابیں شایع کی ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر عظیم عطا فرمائے، اور اس دعوتی اور علمی سلسلے کو قائم اور برقرار رکھے۔ (آمین)

سوال: آپ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کی تعلیمات کو اجاگر کرنے کیلئے کافی کتابیں شایع کی ہیں، سندھی اور اردو میں بھی، اس کا کیا سبب ہے۔؟

جواب: مولانا اشرف علی تھانوی کا شمار امت کے بڑے مجدد دین میں ہوتا ہے، انہوں نے گیارہ سو کتابیں لکھی ہیں، ہر کتاب نئے اور قیمتی نکات سے بھری ہوئی ہے، جن سے ذہن ودل کے دروازے کھلتے ہیں، قرآن اور سنت کے ساتھ، مسلم نفسیات کے موضوع پر مولانا کا کیا ہوا کام ایسا ہے جس کی مثال نہیں ملتی، مولانا کے علمی کام پر جو تحقیق اور تشریح ہونی چاہئے، اس کا عشر عشیر بھی تحقیق نہیں ہوسکی، میں نے مولانا کے ساتھ امت کے دوسرے فاضلوں کو بھی پڑھنے کی کافی کوشش کی ہے، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں مولانا تھانویؒ کی کتابوں میں وہ سارا انتظام اور اہتمام موجود ہے، جس کے ذریعے ہم ایک طرف تو اپنے سلف و صالحین کی قرآن و سنت کی تشریح سے اپنا ربطہ برقرار رکھ سکتے ہیں، دوسرے یہ کہ یہ کتابیں جدید دور کے علمی اور نفسیاتی الجھنوں کو بھی سلجھا سکتی ہیں، اس کے لئے ضروری ہے کہ مولانا کی فکر کی جدید اسلوب میں تشریح کی جائے، اور اس کو نئی زبان میں پیش کیا جائے۔

مسائل، معاملات اور انسانی نفسیات کے متعلق مولانا کے بیان کردہ نکات اتنے اہم ہیں کہ ان نکتوں سے مشکل سے مشکل مسئلے حل ہو جاتے ہیں، خاص طور پہ تصوف میں پیدا ہونے والی خرابیوں ، اور صحیح تصوف کے موضوع پر مولانا کا کام بے مثال ہے۔

مولانا کی فکر، تعلیمات اور ملفوظات کی اس اہمیت کے پیش نظر، میں نے اللہ کے خاص فضل اور توفیق سے مولانا کی کافی کتابوں کی منتخب تلخیص اور تشریح کی ہے، اور ان کی تصانیف کو سمجھنے کیلئے انہیں آسان بنانے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں جو نیا کام ہوا ہے، وہ بیان القرآن میں ''مسائل السلوک'' کے عنوان سے مولانا نے جو حواشی لکھے ہیں، ان کے ذیلی عنوان دیکر سادہ اور سلیس زبان میں ان کا انتخاب پیش کیا ہے، اس کی تشریح بھی کی ہے، چار سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ہے، کتاب کا نام ہے، اہم تفسیری نکات'' اہل محبت اور اہل سلوک کیلئے قرآنی لائحہ عمل۔''

سوال: آپ نے مولانا عبدالماجد دریا بادی کی فکر پر بھی کافی کتابیں شایع کی ہیں، اور ''بیداری اردو'' اور سندھی میں بھی کافی وقت مولانا کے مضامین کا سلسلہ جاری رہا، اس کے متعلق کچھ بتائیں گے۔

جواب: عبدالماجد دریا بادی صاحب جدید فکر اور فلسفے کی بڑی شخصیت ہیں، موصوف دوران تعلیم، جدید ملحد مفکروں کی کتابوں کے مطالعے سے الحاد کی راہ پر چلے گئے تھے، ۱۹۱۰ع سے ۱۹۱۹ع تک وہ ملحد رہے، فلسفۂ نفسیات اور فلسفہ جذبات کے عنوان پر انہوں نے کتابیں لکھیں، ۱۹۲۰ع میں وسیع مطالعے، تلاش، تحقیق کے بعد اللہ نے انہیں ہدایت نصیب کی، اور وہ جدید ملحدانہ فکر کی دلدل سے آزاد ہوئے، اس میں اکبر الہ آبادی کی کاوش کا بڑا عمل دخل ہے، جو ان کے والد کے دوست تھے، اکبر الہ آبادی نے انہیں بڑی حکمت سے قرآن پاک کے مطالعے پر آمادہ کیا، موصوف نے درس نظامی کی باقائدہ تعلیم تو حاصل نہیں کی، لیکن مولانا عبدالباری ندوی صاحب، جو ان

کے دوست تھے، ان سے عربی میں مہارت حاصل کی، تعلیم کے دوران لکھنو گورنمینٹ کالج کی لائبریری میں موجود لگ بھگ ساری اہم کتابیں پڑھ لیں، اس وقت کے لائبریرین نے لکھا کہ میری پچیس سالہ سروس کے دوران یہ پہلے شاگرد ہیں، جنہوں نے لائبریری کی اتنی ساری کتابیں پڑھ لی ہیں۔

موصوف ۱۹۲۴ع سے ۱۹۷۵ع تک یعنی انتقال تک ہفتہ وار رسالہ ''سچ'' ''صدق'' اور ''صدق جدید'' کے نام سے شایع کرتے رہے، ''سچ'' بند ہوا تو ''صدق'' کے نام سے رسالہ جاری کیا، مولانا کی کافی اہم علمی، تحقیقی اور ادبی مضامین ان رسائل کی فائلوں میں محفوظ تھے، جو کتابی صورت میں نہیں چھپ سکے تھے۔

میں نے لکھنو میں مولانا کے داماد محترم عبدالرحیم صاحب سے رابطہ کیا، اور درخواست کی کہ مجھے ان سارے رسالوں کی فوٹو کاپی کروا کے بھیج دیں، میں نے انہیں اس کام کے لئے پیسے بھیج دیئے۔

چونکہ، اس سے قبل مجھے دس سالوں کی فائلیں ڈاکٹر عرفان الکریم انصاری نے دی تھی، باقی فائلیں میں نے لکھنو سے فوٹو اسٹیٹ کی صورت میں منگالی، فوٹو اسٹیٹ اور ڈاک وغیرہ پر کل خرچہ پچیس ہزار کے لگ بھگ آیا۔

سوال: آپ نے مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے مضامین پر منتخب کتاب بھی شایع کی ہے، اور بیداری سندھی اور اردو میں اکثر مولانا کے مضامین شایع کرتے رہتے ہیں، اس سلسلہ میں کچھ بتائیں۔

جواب: اس دور کا سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ اسلامی فکر کی تشکیل نو کا کام

سرانجام ہو، تشکیل نو سے میری مراد متجدد دین کی تشکیل نو نہیں، بلکہ اسلام کو نئی زبان اور علمی اسلوب میں پیش کیا جائے، تاکہ جدید طبقات جن کی ذہنی نشوونما جدیدیت کے پس منظر میں ہوئی ہے، ان کے لئے جدید علمی اسلوب اور انداز بیان میں فہم اسلام کی صورت پیدا ہو سکے، اللہ تعالیٰ نے اس دور میں اس کام کے لئے جن دو چار مفکریں کو کھڑا کیا، ان میں مولانا سید ابو الحسن ندوی کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

ان کی فکر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کہیں بھی جدیدیت سے مرعوبیت کے آثار نہیں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس فکر میں جدید طبقات کو متاثر کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مولانا کی فکر میں اجتہادی صلاحیتوں کے مظاہرہ کے باوجود اسلام کی پیشکش میں بنیادی مسائل میں کہیں بھی بزرگان دین اور سلف صالحین سے ٹکراؤ نہیں۔

مولانا کی فکر کی ان خصوصیات کی وجہ سے ہم نے مولانا کی کتابوں کے خلاصہ پر مشتمل ایک کتاب ''اسلام اور ملت اسلامیہ'' کے نام سے شایع کی ہے، جس سے مولانا کی پوری فکر کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔